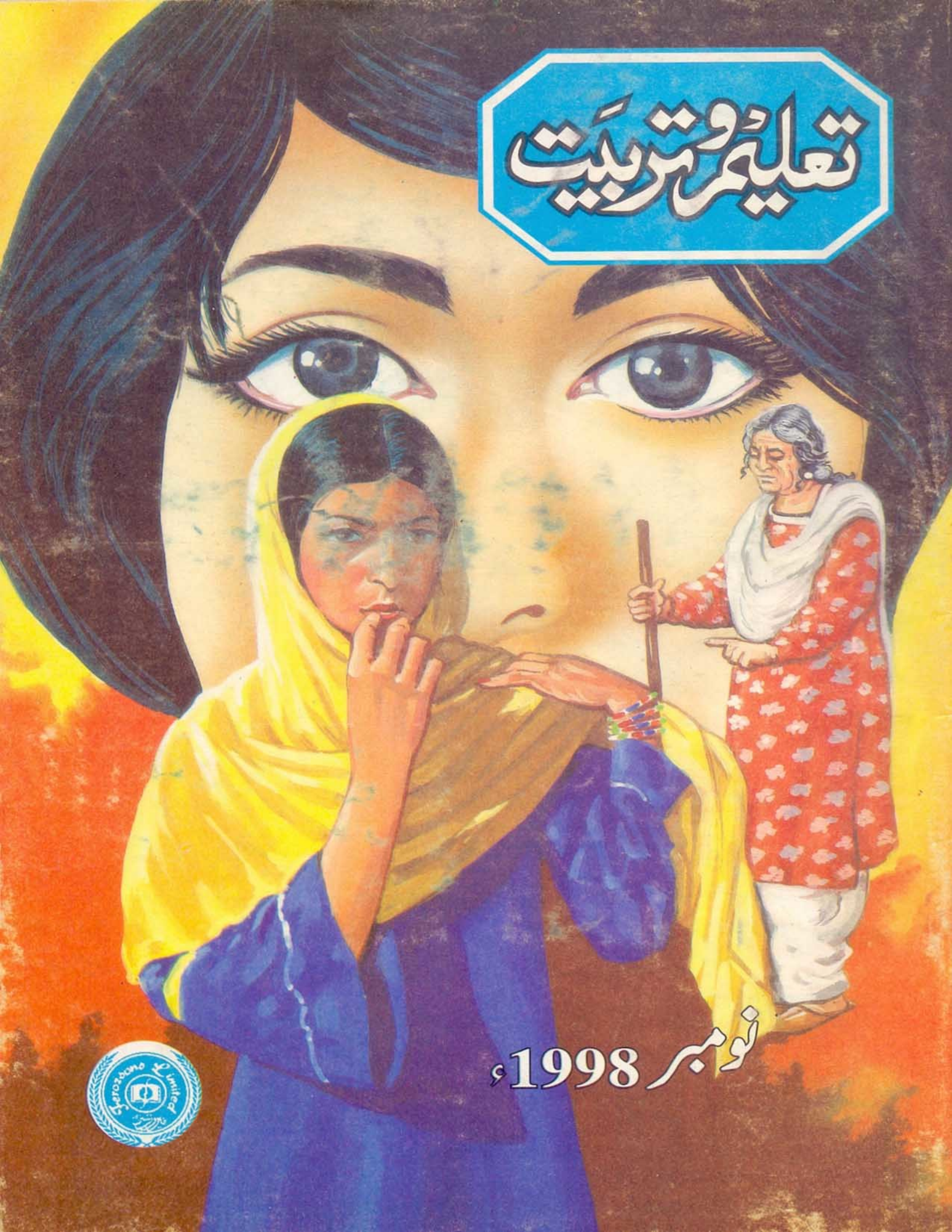
تعلیم و تربیت
نومبر 1998ء

مختصر
انسائیکلوپیڈیا

عالمی معلومات

یہ مختصر انسائیکلوپیڈیا مضمون نگاروں، اخبار نویسوں، طالب علموں اور مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہونے والے امیدواروں کے علاوہ عام شائقین کے لیے بھی معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اس میں زندگی کے تقریباً ہر شعبے اور علم کے جملہ اصناف مثلاً جغرافیہ، تاریخ، سیاسیات، معاشیات، فلکیات، شخصیات، سائنس اور کھیلوں وغیرہ سے متعلق تمام ضروری معلومات مختصر مگر مستند اور جامع انداز میں دی گئی ہیں۔ شروع میں ایک مبسوط باب پاکستان پر ہے۔

ہدایات برائے آرڈرز :

سندھ اور بلوچستان پہلی منزل، مہران ہائیٹس، مین کلفٹن روڈ۔ کراچی فون : 570527
570534-537730

پنجاب 60 شاہراہ قائدِ اعظمؒ۔ لاہور 301196-98

صوبہ سرحد، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے 277 پشاور روڈ۔ راولپنڈی 63503-64273

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور ۔ راولپنڈی ۔ کراچی

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

58 واں سال آٹھواں شمارہ

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف اڈیٹر: عبدالسلام
اڈیٹر پبلشر: ظہیر سلام
مشیر: سعید لخت
سینئر اسسٹنٹ اڈیٹر: رضوان ثاقب
خصوصی مشیر: محمود حسن رومی
اسٹریٹنز ڈیزائننگ: شوکت اعجاز
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

جنگل بن گیا منگل

جنگل میں دہشت گردی۔ باشاہ نے سب جانوروں کو طلب کر لیا۔ تربیت یافتہ استاد منگوائے جائیں (لومڑی)۔ لڑائی جھگڑا کرنے والوں کو جنگل بدر کر دیا جائے (زیبرا)۔ مگر بادشاہ نے کسی کی بات پر کان نہ دھرا اور گدھے کے پیچھے لگ کر جنگل کو دہشت گردوں کا اڈا بنا دیا۔ پولیس دہشت گردوں کے آگے بے بس ہو گئی۔

مزید تفصیلات آئندہ شمارے میں ---- ہمارے جنگلی نامہ نگار سے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

نومبر کا مہینا شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کی ولادت کا مہینا ہے۔ علامہ اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے اور 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں وفات پائی۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو جگایا اور اسے خودی یعنی خود اعتمادی کا پیغام دیا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے کلام کو سمجھیں اور اس پر سچے دل سے عمل کریں۔

ہم نے آپ سے "دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے" کے متعلق پوچھا تھا۔ بہت سارے ساتھیوں نے اس سلسلے کو پسند کیا ہے لہٰذا آئندہ یہ سلسلہ ان شاء اللہ باقاعدگی سے شائع ہوا کرے گا۔

ایک افسوس بھری خبر یہ ہے کہ بچوں کے ہمدرد اور مقبول ادیب حکیم محمد سعید کو 17 اکتوبر کو کراچی میں شرپسندوں نے قتل کر دیا۔ وہ اسلام، پاکستان، علم و ادب اور بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ آج سے 47 سال پہلے 16 اکتوبر 1951ء کو بھی چند شرپسندوں نے قوم کے ایسے ہی ایک عظیم محسن لیاقت علی خان کو راول پنڈی میں قتل کر دیا تھا۔ پاکستان کے عوام اکتوبر کا مہینا ہمیشہ دہرے دکھ اور رنج و الم کے طور پر یاد رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمدرد ملت حکیم محمد سعید اور شہید ملت لیاقت علی خان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) اڈیٹر

نومبر 1998ء

سرورق: اندھی سرجن

پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

قیمت فی پرچہ =/15 روپے
(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

اس شمارے میں

اداریہ		1
علامہ اقبال (نظم)	حفیظ الرحمان احسن	2
محبت کی جیت (کہانی)	اشفاق احمد خاں	3
باکی سکل کا امتحان (کہانی)	نذیر انبالوی	7
مایوس نہ ہوں (درس قرآن)	ڈاکٹر عبدالرؤف	10
اندھی سرجن (کہانی)	نجمہ سراج	11
پیرا شوٹ جمپ (کارٹون کہانی)	شاہد ریاض شاہد	16
سائنس نمائش	حسن ذکی کاظمی	18
کفارہ (سچی کہانی)	نعیم احمد بلوچ	22
بلند ترین مجسمہ	شہناز خان	24
آیئے مسکرائیں (لطائف)		29
دل چسپ اور ناقابل یقین کھیل بغیر خرچ کے	عبدالستار خان طاہر / محمد عمر سلیم	30 / 32
کھیلوں کی دنیا	ابن الطاف	34
ہونہار مصور		38
دھوپ چھاؤں (چھٹی قسط)	سید نظر زیدی	39
وقت (نظم)	ضیاء الحسن ضیاء	47
آپ کا خط ملا		48
علمی آزمائش		51
دوزخ سے فرار (کہانی)	سلیم خان گی	61
بلا عنوان کارٹون		68
باقی سب دل چسپ سلسلے حسب معمول		

سالانہ قیمت
پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے
مشرق وسطیٰ افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/690 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/770 روپے
امریکہ مشرقی بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور
فون: 6278815-6278816-6361309-6361310

علامہ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ ہماری ملت کے ہیں محسن
ان سے الفت کرتے ہیں سب بوڑھے، جوان اور کم سن
"شاعر مشرق" بھی کہتے ہیں ان کو لوگ وطن کے
ان کے شعروں کی خوش بو سے مہکے پھول چمن کے
سب دنیا کے شاعر ان کی عظمت کے گن گائیں
ان کی پیاری باتیں ہم کو سیدھی راہ دکھائیں
عزت اور آزادی سے جینا ہم کو سکھلایا
شعروں میں قرآن کا مطلب خوب ہمیں سمجھایا
ہے اسلام کی عظمت کیا۔ یہ بات ہمیں سمجھائی
چھوڑ کے دین کا سیدھا رستہ عزت کس نے پائی
ان کی اس تعلیم نے ہی غفلت سے ہمیں جگایا
ان کے اس پیغام نے ہی ملت کا خوں گرمایا
ملت کی بہبود کی خاطر کاٹیں جاگ کے راتیں
ان کی نظروں میں رہتی تھیں دشمن کی سب گھاتیں
پاکستان کا خواب انھی نے دیکھا۔ اور دکھایا
قائداعظمؒ نے پھر پیارا پاکستان بنایا!
علامہ اقبالؒ کے ہم پیغام کو عام کریں گے
پڑھ لکھ کر ہم روشن اپنے دیس کا نام کریں گے!

حفیظ الرحمان احسن

اشفاق احمد خاں

محبت کی جیت

ڈاکٹر رشید نے کار اسٹارٹ کی اور کوٹھی کے بیرونی گیٹ سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ پاؤں بریک پر جا پڑے۔ سامنے گیٹ کے باہر کوئی چھوٹا سا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ پتا نہیں کیا چیز تھی' وہ کار سے نیچے اترے اور اس کی طرف چند قدم بڑھائے۔ قریب پہنچ کر انھیں حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بارہ تیرہ سال کا لڑکا تھا جو اپنے ہوش و حواس سے بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر رشید نے اس کی نبض اور دل کی دھڑکن دیکھی۔ بظاہر تو وہ ٹھیک ہی لگتا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر اندر چلے آئے۔

"ارے یہ کون ہے؟" ان کی والدہ خدیجہ بیگم نے انہیں اندر آتے دیکھ کر پوچھا۔

"پتا نہیں ماں جی' باہر گیٹ پر بے ہوش پڑا تھا" اتنا کہہ کر ڈاکٹر رشید نے اسے بستر پر لٹا دیا۔

"بہت پیارا اور معصوم بچہ ہے یہ" خدیجہ بیگم نے اس کے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر رشید نے اسے ایک انجکشن لگایا۔ سوئی کی چبھن محسوس کرتے ہی وہ لڑکا کراہا۔

"یہ ہوش میں آرہا ہے" خدیجہ بیگم بولیں۔

"ماں جی' یہ ابھی تھوڑی دیر میں ہوش میں آجائے گا۔ آپ اس کو کھانا وغیرہ کھلا دیجئے گا۔ میں شام کو واپس آکر اس سے پوچھوں گا کہ یہ کون ہے؟" ڈاکٹر رشید اتنا کہہ کر رخصت ہو گئے۔

خدیجہ بیگم نے محسوس کیا کہ کمرے میں کچھ ٹھنڈک سی ہو رہی ہے۔ انہوں نے گیس کا ہیٹر چلا دیا۔ کمرا گرم ہو گیا تو وہ قریب ہی کرسی ڈال کر اخبار پڑھنے لگیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس لڑکے کو ہوش آگیا۔ اپنے آپ کو گرم بستر اور اجنبی جگہ پر دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ "میں کہاں ہوں؟"

"بیٹا' تم ہمارے گھر میں ہو۔ تم باہر گیٹ پر بے ہوش پڑے تھے۔ میرا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ وہی تمہیں اٹھا کر یہاں لایا ہے" خدیجہ بیگم نے اسے بتایا "لیکن تم یہ بتاؤ بے ہوش کیسے ہو گئے تھے"؟

"پتا نہیں" اس نے مردنی سی آواز میں کہا۔

"کیا تم نے کھانا کھایا ہوا ہے؟"

"نہیں میں نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا"۔

"اوہ' میں ابھی تمہارے لیے کھانا منگواتی ہوں" انہوں نے گھنٹی دے کر گھریلو ملازم فضل کو بلایا اور اسے کھانا لانے کا کہا۔ کھانا آتے ہی وہ لڑکا ندیدوں کی طرح کھانے لگا۔ اس کے انداز سے واقعی لگ رہا تھا کہ وہ دو دن کا بھوکا ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے بستر سے اتر کر جوتے پہن لیے۔

"آپ کا بہت شکریہ بیگم صاحبہ!"

"کس بات کا شکریہ؟" خدیجہ بیگم بولیں: "اور تم کھڑے کیوں ہو گئے' چلو لیٹ جاؤ' ابھی تو تم بے ہوش پڑے تھے۔ کھانا کھاتے ہی کیا اتنی طاقت آگئی" انہوں نے اسے باقاعدہ ڈانٹا۔

وہ لڑکا ڈر سا گیا اور بولا "جی اب مجھے جانے دیں"۔

"بیٹے' تم کون ہو؟ پہلے یہ تو بتاؤ"

"میں بھی ان ہزاروں لوگوں کی طرح ایک ہوں جن کا کوئی نہیں ہوتا" وہ لڑکا سنجیدہ انداز میں بولا۔

"کوئی نہیں ہوتا کیا؟ خدا کے سوا کوئی نہیں ہوتا کہو" خدیجہ بیگم نے اسے سمجھایا۔ "تم کہاں رہتے ہو؟"

"بس کبھی اس کے در' کبھی اس کے در اور کبھی دربدر"

"تم تو پڑھے لکھے لگتے ہو؟" خدیجہ بیگم بولیں۔

"جی ساتویں کلاس تک پڑھا ہوں"۔

"افوہ! اتنی باتیں ہو گئیں' تمہارا نام نہیں پوچھا" خدیجہ بیگم ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"نوید نام ہے" لڑکے نے کہا۔

"پیارا نام ہے.... اچھا یہ بتاؤ ہمارے پاس رہو گے" خدیجہ بیگم دل کی بہت نرم تھیں۔ نوید کی بے چارگی نے انہیں بہت متاثر کیا تھا۔

"آپ مجھے ملازم رکھ رہی ہیں" نوید نے پوچھا۔

"ملازم تو تم اپنے آپ کو نہیں کہہ سکتے۔ ہم نے کبھی کسی ملازم کو بھی ملازم نہیں سمجھا۔ تم اتنے پیارے سے ہو' یہ فیصلہ ہم بعد میں کریں گے کہ تمہارا کیا کام ہو گا"۔ خدیجہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

نوید بھی مسکرا دیا "شکریہ بیگم صاحبہ"۔

"بالکل نہیں" خدیجہ بیگم قدرے ناراض ہو کر بولیں۔

"جی کیا مطلب؟" نوید گھبرا گیا "میرا شکریہ قبول نہیں آپ کو"۔

"شکریہ تو خیر کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہیں البتہ مجھے بیگم صاحبہ کوئی نہیں کہتا۔ کیا بیٹا اور کیا ملازم' سب مجھے "ماں جی" کہتے ہیں"۔

"جی بہتر ماں جی!" نوید نے کہا۔

شام چھ بجے کے قریب ڈاکٹر رشید گھر لوٹے تو نوید کو گھر کا ایک فرد بنا ہوا پایا۔ انہوں نے اپنی والدہ خدیجہ بیگم سے اس کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے ساری بات تفصیل سے ان کو بتا دی اور یہ بھی بتایا کہ اب وہ اسی گھر میں ان کے پاس رہے گا۔

"آپ بھی عجیب ہیں ماں جی" ڈاکٹر رشید نے کہا "جانے کون ہے' کہاں سے آیا ہے؟ کوئی چور اچکا ہی نہ ہو' کوئی چیز لے کر بھاگ گیا تو ہم کہاں تلاش کرتے پھریں گے"۔

"نہیں رشید' میرا دل کہتا ہے کہ یہ کوئی برا لڑکا نہیں ہو سکتا۔ تم دیکھتے نہیں کتنا معصوم اور پیارا ہے"۔

"ماں جی' کسی کے چہرے پر نہیں لکھا ہوتا کہ یہ چور ہے"۔

"تم کچھ بھی کہو' یہ بچہ مجھے بہت پیارا لگا ہے' جب میرے دل نے کہہ دیا کہ یہ اچھا لڑکا ہے تو پھر مجھے خدا سے بھی امید ہے کہ وہ اسے ہمارے لیے اچھا ہی رکھے گا"۔

"ٹھیک ہے ماں جی!" ڈاکٹر رشید مسکرائے "آپ کا حکم سر آنکھوں پر!"

نوید دوسرے کمرے میں کھڑا ان کی یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ ڈاکٹر رشید کے آخری فقرے نے اس کے دل کو مطمئن کر دیا تھا۔ خدیجہ بیگم نے نوید کے ساتھ بالکل بیٹوں جیسا سلوک کیا۔ نوید نے بھی اپنے آپ کو بہت فرماں بردار ثابت کیا۔ جس کے نتیجے میں خدیجہ بیگم نے اسے اسکول میں داخل کروا دیا۔ ڈرائیور اسے کار میں چھوڑ کے آتا اور چھٹی کے وقت اسے لے کر آتا۔ نوید ان لوگوں کی محبت دیکھ کر دل میں سوچتا کہ میں اس قابل تو نہیں ہوں یہ پھر بھی مجھ سے اپنوں جیسا پیار کرتے ہیں۔ ایک ماہ میں ہی وہ گھر کا مکمل فرد بن گیا۔ اس کے دل سے اجنبیت کا احساس ختم ہو گیا تھا۔

ایک دن خدیجہ بیگم گھر کی بالائی منزل پر ایک کھڑکی کے پردے درست کر رہی تھیں کہ ان کی نظر نوید پر پڑی۔ وہ کوٹھی سے تھوڑی دور ایک آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس آدمی نے نوید کو ایک تھپڑ دے مارا' خدیجہ بیگم کو طیش آ گیا' وہ نیچے جانا چاہتی تھیں کہ پھر دوسرا منظر دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ نوید نے اس آدمی کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ شاید وہ رو بھی رہا تھا۔ اس آدمی نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک دیا اور غصے سے کچھ کہہ کر چل پڑا۔ اس کے جانے کے بعد نوید کچھ دیر یونہی کھڑا رہا' پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا کوٹھی میں داخل ہو گیا۔

خدیجہ بیگم منتظر رہیں کہ وہ خود انہیں کچھ بتائے' لیکن اس نے کچھ نہ کہا بلکہ اسکول کا کام کرنے لگا۔ لیکن اس کے انداز سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ خدیجہ بیگم کا دل بہت چاہ رہا تھا کہ اس سے سارا معاملہ پوچھیں۔ مگر انہوں نے اپنے آپ پر جبر کیے رکھا۔ لیکن تیسرے دن ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک آدمی نے نوید کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ وہ تو شکر ہے کہ ہمسایوں کا چوکی دار دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے للکار کر روکا اور وہ نوید کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ شور سن کر خدیجہ بیگم بھی باہر نکل آئی تھیں۔ سارا واقعہ معلوم ہونے کے بعد وہ نوید کو اندر لے گئیں۔

"نوید بیٹے' یہ آدمی کون تھا؟" خدیجہ بیگم نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"ماں جی، میں تو نہیں جانتا" نوید نے جواب دیا۔

"کیا کہا؟" خدیجہ بیگم کو غصہ آگیا۔ لیکن انہوں نے خود پہ قابو رکھا "نوید، کیا ہم نے تمہیں بیٹوں کی طرح نہیں رکھا؟ کیا ہم نے تمہیں اپنوں جیسا پیار نہیں دیا"؟

"دیا ہے ماں جی" نوید سر جھکا کر بولا۔

"پھر مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟ میں نے تو پرسوں بھی تم سے اس لیے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ تم مجھے خود بتاؤ گے کہ ایک آدمی نے تمہیں تھپڑ مارا ہے"۔

نوید کا رنگ فق ہو گیا "آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"میں نے اپنی آنکھوں سے سارا معاملہ دیکھا تھا"۔

نوید کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بری طرح رونے لگا۔

"خوب رو لو، دل کا غبار نکال لو، لیکن تم مجھے بتاؤ گے کہ وہ کون لوگ تھے؟" خدیجہ بیگم کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"مجھے معاف کر دیجیے، میں نے آپ کو دھوکے میں رکھا..."

"کوئی بات نہیں.... اب بتا دو.... ہر بات کی تلافی ہو جائے گی"۔

"وہ دونوں آدمی مجرم ہیں.... چور ہیں، آپ کے ہاں چوری کرنا چاہتے ہیں"۔

خدیجہ بیگم کو ایک لمحے کے لیے تو ان الفاظ پر یقین نہ آیا۔

"لیکن تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟"

"وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کے پاس کئی لڑکے ہیں۔ وہ مختلف طریقوں سے ان لڑکوں کو گھروں میں داخل کروا دیتے ہیں پھر وہ لوگ موقع پا کر چوری کر لیتے ہیں"۔

"ان لڑکوں کا کیا کام ہوتا ہے؟" خدیجہ بیگم نے سوال کیا۔

"وہ گھر والوں کے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دیتے ہیں اور ان لوگوں کو اندر آنے کا راستہ بتاتے ہیں"۔

"تمہارے ذمہ بھی یہی کام تھا" خدیجہ بیگم کے لہجے میں دکھ تھا۔

"جی ہاں" نوید نے اعتراف کیا۔

"تو اب تک تم نے یہ کیا کیوں نہیں؟"

"آپ لوگوں نے مجھے جتنا پیار دیا، اس کے جواب میں اگر میں ایسی حرکت کرتا تو پھر آپ ساری عمر کے لیے مجھ جیسے کسی بچے کا اعتبار نہ کرتے۔ میں نے اسی لیے ان کو انکار کر دیا تھا۔ جس کے جواب میں پہلے انہوں نے مجھے مارا اور پھر زبردستی ساتھ لے جانے کی کوشش کی"۔

"لیکن تم ہمارے گھر کے باہر بے ہوش کیسے ہوئے تھے؟ یہ کیسے کیا تم نے؟"

"انہوں نے مجھے دو دن تک بھوکا رکھا تھا اور پھر انہوں نے مجھے کوئی دوا سنگھا کر بے ہوش کر دیا"۔

"تم نے ان کے ساتھ کل کتنی چوریاں کیں؟" خدیجہ بیگم نے پوچھا۔

"یہ پہلی مرتبہ ہے" نوید شرمندگی کے ساتھ بولا۔

"اور پہلی مرتبہ ہی تم نے انہیں دھوکا دے دیا" خدیجہ بیگم مسکرائیں۔

"آپ کی صحبت میں رہ کر مجھے اچھائی اور برائی میں فرق معلوم ہو گیا ہے۔ اب میں برائی کے راستے پر نہیں چلنا چاہتا، آپ مجھے ان سے بچا لیں" نوید کے لہجے میں التجا تھی۔

"ضرور بچائیں گے۔ اللہ نے چاہا تو تم اچھے آدمی بنو گے"۔

خدیجہ بیگم نے اپنے بیٹے ڈاکٹر رشید کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی۔ وہ بھی پہلے حیران اور پھر پریشان ہو گئے اور فوری طور پر گھر آ گئے۔ ڈاکٹر رشید اسے ساتھ لے کر پولیس کے پاس پہنچے۔ پولیس انسپکٹر ڈاکٹر رشید کا جاننے والا تھا۔ اس نے ذاتی دل چسپی لے کر ساری بات سنی۔ اس نے نوید کو شاباش دی اور کہا کہ وہ پولیس کی مجرموں کے ٹھکانے تک رہنمائی کرے۔

"وہ تو میں نہیں جانتا"۔

"کیا مطلب ہے تمہارا، تم ان کے ساتھ نہیں رہتے تھے؟" پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔

"ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ لیکن جب وہ کسی لڑکے کو کسی کے گھر بھجواتے تھے تو فوراً اپنا ٹھکانہ بدل لیتے تھے تاکہ اگر وہ پکڑا جائے تو کوئی ان کو نہ پکڑوا دے" نوید نے بتایا۔

"تو پھر اب ہم کیسے ان تک پہنچیں گے؟" ڈاکٹر رشید نے پوچھا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ پھر آئیں گے" نوید نے کہا "وہ اتنی جلدی ناامید ہونے والے نہیں ہیں"۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے تم انہیں یہی تاثر دو گے کہ تم ان کے ساتھ ہو"۔

"ٹھیک ہے سر" نوید نے کہا۔

نوید کا کہنا درست نکلا۔ ان لوگوں نے ایک شام اسے بازار میں گھیر لیا۔ نوید نے بڑی چالاکی سے انہیں یہ یقین دلا دیا کہ وہ بھٹک گیا تھا لیکن اب وہ ان کا ساتھ ضرور دے گا۔ چنانچہ جب وہ گھر لوٹا تو بے ہوشی کی دوا اس کے پاس تھی اور ان کے آنے کا وقت رات کے دو بجے کا طے ہوا تھا۔ ڈاکٹر رشید نے پولیس کو فون کر کے بتا دیا۔ چنانچہ سادہ لباس میں پولیس کے آدمی بہت پہلے سے ہی ادھر ادھر چھپ گئے تھے۔ گھر کے اندر صرف تین پولیس والے چھپے تھے۔ رات کے دو بجے نوید نے گیٹ کھول دیا۔ اور تین افراد منہ چھپائے اندر آ گئے۔ "سب ٹھیک ہے نا!" ایک نے پوچھا۔

"ہاں، سب بے ہوش پڑے ہیں" نوید نے انہیں اطمینان دلایا۔

وہ تھوڑا سا آگے بڑھے تھے کہ اندر کھٹکا سا ہوا۔ وہ تینوں بدک گئے۔ "یہ کیا ہے؟" ایک آدمی نے پستول کی نال نوید کے سر کے ساتھ لگا دی۔ "یہ اندر سے آواز کیسی آئی ہے؟" اس نے غرا کر پوچھا۔

"ارے کچھ نہیں، بلی ہو گی شاید" نوید نے خوف زدہ سی آواز میں کہا۔

"مجھے تو دال میں کچھ کالا کالا نظر آ رہا ہے" ان میں سے ایک بولا۔

"لیکن مجھے تو ساری دال کالی نظر آ رہی ہے۔ نوید سچ سچ بتاؤ وہ لوگ بے ہوش بھی ہوئے ہیں یا نہیں" پستول والے نے پوچھا۔

"یار، اندر چل کے خود دیکھ لو" نوید نے اکتا کر کہا۔

وہ نوید کو پستول کی نال سے دھکیلتے ہوئے اندر لے گئے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی "ہینڈز اپ" کی آواز ابھری اور پولیس کے جوانوں نے انہیں گھیر لیا۔ پستول والے نے تڑپ کر نوید کی طرف رخ کر کے گولی چلانا چاہی لیکن نوید اس کے بازو سے لٹک ہی گیا۔ فائر ہوا لیکن گولی اسے لگنے کے بجائے فرش میں دھنس گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس سے پستول چھین لیا گیا۔ خدیجہ بیگم اور ڈاکٹر رشید بھی اندر آ گئے۔ خدیجہ بیگم نے کہا "انسپکٹر صاحب، ان لوگوں کو انتہائی سخت سزا ملنی چاہیے۔ معصوم بچوں کو جرم کے راستے پر لگانا انتہائی گھناؤنا جرم ہے"۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ لیکن آپ نے تو ایک نوید کو اچھی راہ پر لگا لیا اس طرح کے جو بے شمار بچے بے یار و مددگار پھر رہے ہیں ان کو کون سیدھی راہ پر لگائے گا؟" انسپکٹر نے کہا۔

ڈاکٹر رشید بولے "اگر ہر فرد اپنے اردگرد پائے جانے والے ایک بچے کو بھی زندگی اچھے طریقے سے گزارنے کے وسائل فراہم کر دے تو کوئی بچہ بگڑ کر جرم کے راستے پر نہ چلے"۔

"ہاں، اس کے لیے فراخ دلی کا مظاہرہ کرنے کی بھی ضرورت ہے" انسپکٹر صاحب بولے "اگر آپ نوید کو اتنا پیار نہ دیتے تو ہو سکتا ہے کہ وہ یہ جرم کر ہی ڈالتا"۔

"جی ہاں انسپکٹر صاحب، محبت فاتح عالم ہے" خدیجہ بیگم بولیں "اور محبت کبھی ناکام نہیں ہوتی"۔

☆ ☆ ☆

بائی سکل کا امتحان

نذیر انبالوی

شام کو خالو شوکت فیکٹری سے آئے تو وہ اکیلے نہیں تھے' ان کے ساتھ ایک عجیب وغریب بائی سکل بھی تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی اس کو بغور دیکھنے لگے۔ خالو نے جیسے ہی بائی سکل کو دیوار کے سہارے کھڑا کیا' ہم نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"خالو جان! کیا اسے عجائب گھر سے لائے ہیں؟"۔ میں نے پوچھا۔

"نہیں تو .... یہ میں نے ایک دوست سے خریدی ہے' بہت عمدہ بائی سکل ہے"۔

"شکل ہی سے لگ رہی ہے کہ بہت عمدہ ہے' ویسے خالو جان کتنے میں خریدی ہے؟" نومی نے آنکھیں مٹکائیں۔

"صرف 200 روپے میں"۔

200 روپے میں تو یہ بہت مہنگی ہے" میں نے کہا۔

"200 روپے میں آج کل بائی سکل کہاں ملتی ہے" خالو بولے۔

"خالو جی یہ تو میں 50 روپے میں بھی نہ لوں" میں نے کہا۔

"مت لو' تمہیں دے کون رہا ہے" یہ کہ کر خالو جان اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ہم دونوں بائی سکل کو تنقیدی نظر سے دیکھنے لگے۔ بائی سکل کے ریم زنگ آلود' پیڈل غائب' گدی ایک طرف جھکی ہوئی' رنگ خراب' چین بے کار اور فریم ویلڈنگ زدہ تھا۔

"آپی! کیا یہ بائی سکل کبھی چلتی بھی ہو گی؟" نومی نے مجھ سے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے دو تین صدیاں قبل یہ حادثہ پیش آتا ہو' میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ اب یہ کیسے چلے گی"۔

خالو جان کا خاندان ایک گاؤں میں آباد تھا۔ لیکن وہ خود شہر میں ملازم ہونے کی وجہ سے ہمارے ہاں مقیم تھے۔ ہمارا گھر بڑی سڑک سے خاصا دور ہے۔ خالو جان کو فیکٹری جانے آنے میں بہت دقت تھی۔ انہوں نے یہ بائی سکل اسی مقصد کے لئے خریدی تھی۔ اور اس کے بعد انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز کر دی تھی۔ خالو جان ابھی بائی سکل پر فیکٹری تو نہیں جاتے تھے البتہ وہ کبھی کبھار اس کو سیر

کروانے ضرور لے جاتے تھے۔ ایک دن ہم بھی خالو جان اور بائی سکل کے ہم راہ تھے۔ خالو جان اس پر سوار ہونے کے بجائے اسے اپنے ساتھ پیدل چلاتے رہے۔

"خالو جان! بائی سکل پر سوار ہو جائیں"۔

اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتے نومی میری بات سن کر جھٹ سے بولا "بائی سکل کی طبیعت ٹھیک نہیں"۔

خالو جان نے ہمیں ناخوش گوار انداز میں گھورا پھر کہا "بیٹھو" "مائرہ تم پیچھے بیٹھو اور نومی تم آگے---"

"مگر کیوں؟" ہم نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"ہم بائی سکل کی سواری کریں گے .... آج اس کا امتحان ہے"۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے خالو جان کے حکم کی تعمیل کی۔ انھوں نے فٹ پاتھ پر بایاں پاؤں رکھ کر دائیں پاؤں سے پیڈل پر دباؤ ڈالا تو بائی سکل سچ مچ سڑک پر حرکت کرنے لگی۔ ہم ابھی اپنی خوشی کا اظہار بھی نہ کر پائے تھے کہ اس کا ڈھیلا ہینڈل مڑ کر نومی کی پسلی سے جا ٹکرایا۔ نومی نے چیخ ماری تو خالو جان بوکھلا گئے' اسی بوکھلاہٹ میں بائی سکل ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ اگلے ہی لمحے ہم تینوں سڑک پر پڑے تھے اور بائی سکل ہم پر سوار تھی۔ وہ امتحان میں فیل ہو گئی تھی۔ گھر آتے وقت ہم راستہ بھر اسے کوستے آئے۔ گھر پہنچ کر بائی سکل کے سفر کی کہانی امی جان کو سنائی۔

اسٹینڈ خراب ہونے کی وجہ سے بائی سکل خوف ناک صورت بنائے ایک طرف جھکی کھڑی تھی۔ سبھی گھر والے اس عجوبے کو تکتے اور مسکرا کر رہ جاتے۔ محلے بھر کے بچے اس عجیب و غریب چیز کو دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ خالو جان اپنی بائی سکل کے بارے میں ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہ تھے' کیوں کہ وہ اس نادر بائی سکل پر 300 روپے مزید خرچ کر چکے تھے۔ بائی سکل میں صرف ایک چیز ڈھنگ کی تھی اور وہ تھی اس کا مضبوط تالا۔

ایک دن اسی تالے کی وجہ سے خالو جان 500 روپے کے نقصان سے بچ گئے تھے' ہوا یوں کہ خالو جان بائی سکل کو ٹہلاتے ٹہلاتے نزدیکی ڈاک خانے لے گئے۔ اپنی پیاری بائی سکل کو ایک طرف کھڑا کر کے خط ڈاک میں ڈالنے اندر چلے گئے۔ وہ تھوڑی دیر میں لوٹے تو ایک چور تالا کھولنے میں مصروف تھا۔ خالو جان کے للکارنے پر چور بھاگ کھڑا ہوا۔ یوں یہ چوری ہونے سے بال بال بچ گئی۔ مجھے چور کی عقل پر رونا آ رہا تھا کہ اس نے ایسی "نادر چیز" چرانے کا ارادہ ہی کیوں کیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے نئے تالے کی ضرورت ہو۔

چند دنوں سے خالو جان بائی سکل کو اپنے ساتھ فیکٹری لے جانے لگے تھے۔ حیران کرنے والی بات یہ تھی کہ وہ اس پر سوار بھی ہوتے تھے۔ جس روز بارش ہوتی خالو جان اسے حفاظت کے لئے اپنے کمرے میں رکھ دیتے' جب کبھی فیکٹری سے آتے اچانک بارش اسے گیلا کر دیتی تو گھر پہنچ کر اس کی خوب صفائی کرتے۔ خالو جان گاؤں جاتے تو بائی سکل کو کمرے میں رکھ کر اس پر چادر تان دیتے تاکہ گرد و غبار نہ پڑے۔ مگر مجھے یہ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اسے کسی کباڑیے کے ہاتھوں بیچ دوں مگر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

ایک طرف تو میری بائی سکل سے دشمنی جاری تھی اور دوسری طرف میٹرک کے بورڈ کا امتحان ہو رہا تھا۔ ایک صبح وین والے نے اس وقت مجھے مشکل میں ڈال دیا جب اس نے پرچہ شروع ہونے سے ایک گھنٹا پہلے وین میں خرابی کا کہ کر آنے سے انکار کر دیا۔ میرا امتحانی مرکز شہر کے دوسرے کونے میں تھا' جہاں براہ راست کوئی وین نہ جاتی تھی۔ ابا جان اپنی موٹر سائیکل پر دفتر جا چکے تھے۔ میرے پاس صرف ایک گھنٹا تھا۔ اب ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا بذریعہ رکشا۔ رکشا لانے کے لئے خالو جان کو بھیجا گیا مگر خراب سڑک کے باعث ہمارے علاقے میں رکشے بہت کم آتے ہیں۔ خالو جان 20 منٹ ضائع کر کے ناکام لوٹ آئے۔ میں جھنجھلا سی گئی اور سوچ میں پڑ گئی کہ اب کیا کروں۔ اگر بڑی

سڑک تک پیدل بھی جاؤں تو مزید 20 منٹ صرف ہو جائیں گے۔ مجھے پریشان دیکھ کر خالو جان بولے "بیٹی' پریشان کیوں ہوتی ہو؟ میری بائی سکل کس روز کام آئے گی؟"۔

"آپ کی بائی سکل" میں نے دہرایا۔

"اب یہ پہلے جیسی نہیں' آزمائش شرط ہے" خالو جان بولے میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پرچہ شروع ہونے میں صرف 20 منٹ باقی تھے۔ میں خالو جان کے ساتھ اسٹاپ پر کھڑی ہر آنے والی وین کو دیکھتی۔ کسی میں بھی اگلی سیٹ

خالی دکھائی نہ دیتی۔ میں بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ہر گزرنے والا لمحہ مجھے فکر میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں نے آج پرچہ حل نہ کیا تو میرا ایک قیمتی سال ضائع ہو جائے گا۔ گھبراہٹ کے مارے میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسے حالات سے دوچار ہوں گی۔ میرے چہرے کی پیلی رنگت دیکھ کر خالو جان بولے۔

"بیٹا' میں نے کہا ہے ناں' کہ یہ اب پہلے جیسی نہیں رہی آپ بلاخوف و خطر اس پر بیٹھ جائیں"۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور میرے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اسی لمحے بائی سکل پر سوار ہونے کا فیصلہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد میں کیریئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے جتنی دعائیں یاد تھیں ان کا ورد میری زبان پر تھا۔ مجھے ہر جھٹکے پر یہی محسوس ہوتا کہ اب گری کہ اب گری۔

جب بائی سکل امتحانی مرکز کے قریب پہنچی تو میرے لبوں پر اس کے لئے اچھے کلمات تھے۔ میں مقررہ وقت پر امتحانی مرکز پہنچ گئی۔ خالو جان پسینے میں شرابور تھے۔ میں نے خالو جان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بائی سکل پر نگاہ ڈالی' وہی بائی سکل جو مجھے کبھی بھی نہ بھائی تھی آج بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بائی سکل نے مجھے اپنے وجود کا احساس دلاتے ہوئے وہ کچھ کر دکھایا تھا جو بظاہر ہونا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ میں بائی سکل کو پیار بھری نظروں سے تکتے ہوئے امتحانی مرکز میں داخل ہو گئی۔ میں امتحان میں کام یاب ہوتی ہوں یا نہیں اس کا پتا تو بعد میں چلے گا مگر آج خالو جان کی بائی سکل امتحان میں کام یاب ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

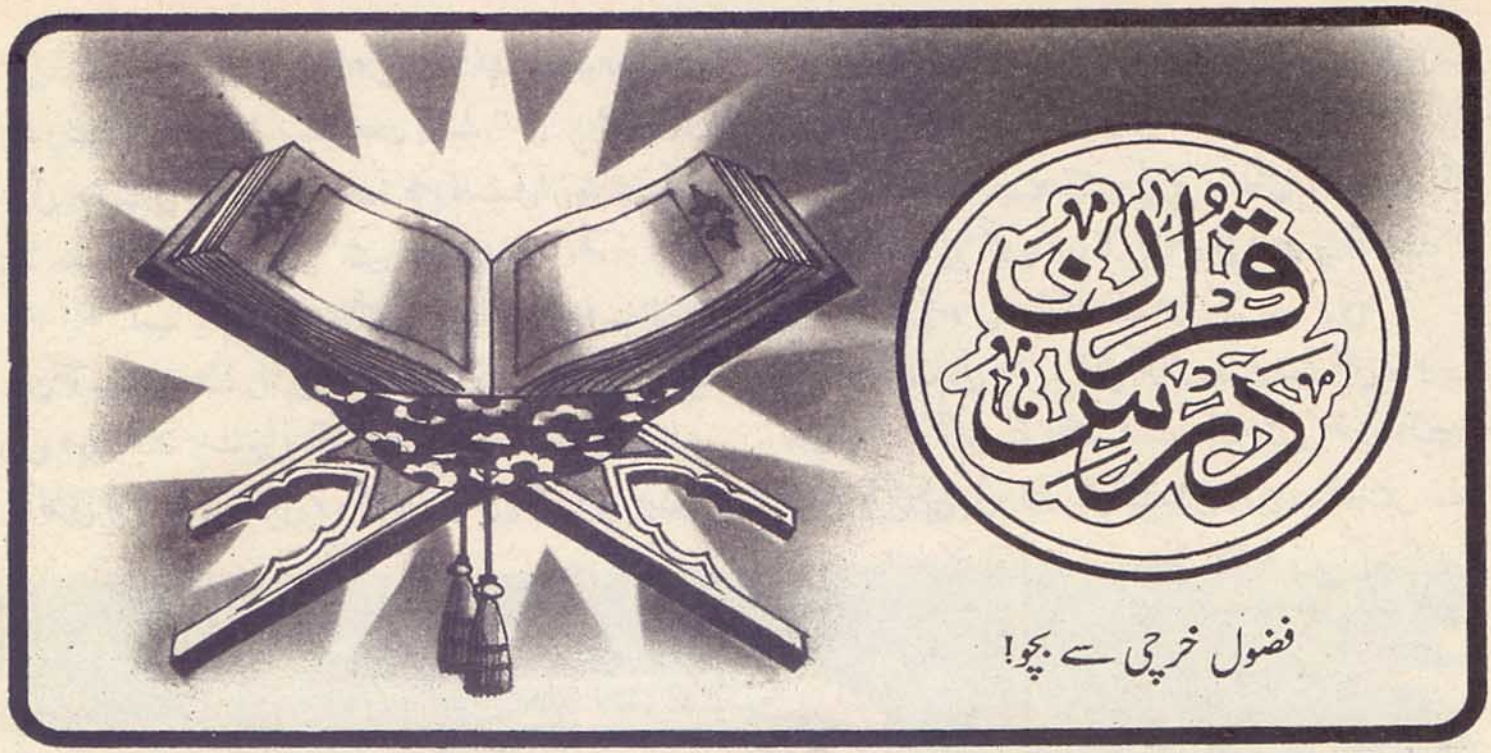

فضول خرچی سے بچو!

پاکستان تیسری دنیا کا ایک غریب ملک ہے۔ وسائل کی کمی، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور دانش مند قیادت کے قحط نے یہاں ایک ہنگامہ بپا کیا ہوا ہے۔ ایسے میں چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اپنے روزمرہ اخراجات میں احتیاط، میانہ روی اور دانش مندی کا ثبوت دیتے اور ہر قسم کی فضول خرچیوں سے پرہیز کرتے۔ مگر صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ چھوٹی بڑی فضول خرچیوں کی چھاپ ہماری زندگی کے تمام شعبوں کا معمول بن چکی ہے۔

اس اہم موضوع کے بارے میں ہم نے قرآن حکیم کے آٹھویں پارہ کی چھٹی سورہ کی آیت نمبر141 کے ان دو الفاظ کا انتخاب کیا ہے:۔

لا تسرفوا

ترجمہ: بے جا خرچ مت کرو!

فضول خرچی خواہ ذاتی زندگی میں کی جائے یا اجتماعی میں یہ غیر اسلامی حرکت ہر اعتبار سے بری بھی ہے اور مضر بھی، ہمارے ہاں روزمرہ زندگی میں فضول خرچی کا افسوس ناک مظاہرہ جن شعبوں میں عام ہوتا ہے ان کی چند مہلک مثالیں یہ ہیں:۔ پیدائش اور موت کے مواقع، شادی بیاہ کی پر تکلف تقریبیں، لباس و غذا کے انتخاب، فضول عیش و عشرت کی علتیں اسی طرح کے دیگر موقعوں پر محض انا "ناک" دکھاوے اور عیش کی خاطر ہم دولت بے دریغ خرچ کر دیتے ہیں۔ دولت اللہ تعالیٰ کی مقدس امانت ہے۔ یہی دولت ہم اپنے مفید ذاتی کاموں اور ملی منصوبوں پر خرچ کر کے طرح طرح کے بے شمار فائدے حاصل کر سکتے تھے۔

اسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی ہم طرح طرح کی فضول خرچیاں کرتے رہتے ہیں۔ جن سے بچنا ملی زندگی میں اصلاح اور ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ مثلاً ہم اپنی سرکاری اور قومی تقریبوں پر بے دریغ وقت اور دولت صرف کر دیتے ہیں، ملی موقعوں پر چراغاں ہی کو لے لیجئے۔ ہمارے ہاں بجلی کا پہلے ہی قحط ہے۔ صحت اور زراعت کے شعبے خاص کر بجلی کی کم یابی سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں مگر ہم اپنے قومی اور مذہبی تہواروں پر بے تحاشا چراغاں کر کے اپنی ایک قیمتی نعمت کو اس قدر بے دردی سے ضائع کر دیتے ہیں کہ ہر حساس محب وطن کانپ اٹھتا ہے۔

فضول خرچی ذاتی ہو یا اجتماعی یہ ہر اعتبار سے بہت بری حرکت ہے۔ فضول خرچ ایک مفید قرآنی حکم کی صاف خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

اندھی سہرجن

نجمہ معراج

تھیں تو وہ بی بی نوراں مگر ابھی چودہ برس کی تھیں کہ اچانک ان کی آنکھوں کا نور جاتا رہا تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے اندھی ہو گئی تھیں۔ بی بی نوراں ہر وقت خدا کا شکر ادا کرنے والی خاتون تھیں۔ اس لیے انہیں کبھی کسی چیز کا غم نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ خوش رہتی تھیں۔ مگر انہیں ایک چیز کا شدید احساس تھا وہ یہ کہ کاش انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ چودہ برس کی عمر میں اندھی ہو جائیں گی اور وہ فطرت کے حسن کو جی بھر کر دیکھ لیتیں۔

بی بی نوراں کا گھرانہ بڑا مختصر تھا۔ ایک بہو اور اس کے دو بچے، نعیمہ جو تقریباً تیرہ چودہ سال کی تھی اور ایک بارہ برس کا اس کا بھائی جس کا نام مبین تھا۔ مبین تو اسکول جاتا تھا لیکن نعیمہ اپنے والد کی وفات کے بعد پڑھ نہ سکی تھی۔ البتہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو ہر قیمت پر پڑھانا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے اور گھر چلانے کے لیے اب اسے محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی۔

ایک رات بہت گرمی تھی۔ گھر کے سب افراد صحن میں سو رہے تھے۔ جب کہ گرمی کی شدت سے بی بی نوراں اور نعیمہ کو نیند نہ آرہی تھی۔ وہ اپنی چارپائی چھت پر لے گئیں۔ وہاں دونوں دادی پوتی آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ نعیمہ آج دادی اماں سے بار بار پوچھ رہی تھی "بی بی جی، آپ سارے کام کر لیتی ہیں۔ آپ کو آنکھیں نہ ہونے کی وجہ سے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ جب میری کوئی سہیلی چپکے سے دبے پاؤں بھی آئے تو تب بھی آپ پہچان لیتی ہیں کہ یہ میری کون سی سہیلی ہے۔ کڑھائی سلائی اور خانہ داری کا کام بھی کر لیتی ہیں آخر کیسے؟"

دادی اماں بولیں "بیٹا، کیا پوچھتی ہو، آنکھوں کا نور تو میری شادی سے بھی دو برس پہلے ہی چھن چکا تھا پھر مجھے دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے سب کچھ ہی تو کرنا پڑا۔ اور اب الحمدللہ مجھے یہ کام کرتے ہوئے ذرا دقت نہیں ہوتی۔ صرف مجھے ایک بات کا دکھ ہے کہ جب میری آنکھیں تھیں، اس وقت میں فطرت کے حسن کو جی بھر کر نہ دیکھ

سکی۔ اپنی امی کی آنکھوں میں میرے لیے موجود پیار' باپ کی شفقت بھری مسکراہٹ' بچوں کے چہروں پر تازہ کھلے ہوئے گلاب جیسی رونق' سرسبز کھیت' تاروں بھرا آسمان' سورج کے طلوع اور غروب ہونے کا دل کش نظارہ' یہ سب چیزیں مجھے اب خواب نظر آتی ہیں۔ ان چیزوں کو جی بھر کر نہ دیکھنے پر مجھے بہت پچھتاوا ہے۔

اس لیے بیٹا میں تو آپ کو یہی نصیحت کرتی ہوں کہ آپ خانہ داری کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اس حسین کائنات کا بھی دل کھول کر نظارہ کرو۔ یہ تو حقیقت ہے کہ والد کی وفات کے بعد تم پر بڑوں کی سی ذمہ داریاں پڑ گئی ہیں۔ گھر کے خرچے کے علاوہ تم نے اپنے بھائی کے تعلیمی اخراجات بھی تو پورے کرنے ہوتے ہیں۔ مگر اس مصروفیت کے باوجود اپنی آنکھوں سے جو حسین منظر دیکھو اس کو دل میں سمونے کی کوشش کرو۔

جب سے نعیمہ کے ابو نے ان کا ساتھ چھوڑا تھا' نعیمہ نے اسکول چھوڑ دیا تھا اور گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر محنت مزدوری کرنی شروع کر دی تھی۔ اب تو سارا سارا دن دھوپ میں کپاس چنتے' کبھی مرچیں توڑتے' کبھی مختلف سبزیاں زمین سے اکھاڑتے اور بوریوں میں بھرتے گزر جاتا۔ لیکن وہ یہ سب کچھ خوش دلی کے ساتھ کرتی تھی۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ اس کی یہ محنت ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائے گی اور اس کا چھوٹا بھائی پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جائے گا۔

پھر اماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "نعیمہ بیٹا' سو جاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ یہ اس نے آپ کو ہاتھ پاؤں اور آنکھوں جیسی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اپنی مفلسی پر کبھی شکایت زبان پر نہ لانا۔ غریبی امیری زندگی کا حصہ ہوتی ہے۔ جس کے جسمانی اعضا سلامت ہوں اسے برے حالات سے گھبرانا نہیں چاہیے"۔

وقت یونہی گزرتا رہا۔ روزانہ کی طرح ایک صبح نعیمہ کی چند سہیلیاں سر پر ٹوکریاں رکھے' نعیمہ کو آواز دیتی ہوئی نعیمہ کے گھر میں داخل ہوئیں۔ جب کہ نعیمہ ابھی تک چارپائی پر پڑی سو رہی تھی۔ نعیمہ کی دادی نے آواز دی "نعیمہ' بیٹا اٹھو آپ کا کام پر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہ دیکھو آپ کی سہیلیاں ناشتہ کر کے بھی آگئی ہیں"۔

نعیمہ کہنے لگی "دادی اماں آج میرا جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ میری آنکھوں میں درد ہو ہو رہا ہے۔ اور سر کے پیچھے بھی"

اماں نوراں کہنے لگیں "خدا خیر کرے آنکھوں میں درد؟ میں تو آنکھوں کے درد سے بہت خوف زدہ ہوں"۔

اتنے میں نعیمہ کی امی ہاتھ میں لسی کا گلاس پکڑے آئیں اور کہنے لگیں "یہ لو نعیمہ بیٹی' یہ پی لو۔ میں سن رہی تھی کہ آپ کی آنکھوں میں درد ہو رہا ہے۔ اگر کام پہ جانے کو جی نہیں چاہتا تو نہ جاؤ"۔

"نہیں امی جان' میں گھر میں نہیں رہ سکتی۔ نہ جا کے تو گزارہ نہیں ہو گا نا۔ دودھ والے کے پیسے بھی تو دینے ہیں۔ میرا ایک دن ضائع ہو جائے گا۔ اور رات کے لیے وہاں سے سبزی بھی تو لے کے آنا ہے"۔

یہ کہ کر نعیمہ نے ٹوکری اٹھائی اور سہیلیوں کے ساتھ چلی گئی۔

اماں نوراں نے اپنی بہو کو آواز دے کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگیں "بیٹا' میں تو نعیمہ بیٹی کی آنکھوں کے درد سے بہت خوف زدہ ہوں۔ میری جب بینائی ختم ہوئی تھی تو پہلے آنکھوں میں درد ہی ہوا تھا۔ تم یہ بات نعیمہ کو نہ بتانا لیکن میری تسلی کے لیے اس کے ماموں ڈاکٹر حنیف کے گھر جانا اور اسے نعیمہ کی آنکھوں کی ساری حقیقت بتانا"۔

نعیمہ جب کام پر چلی گئی تو اس کی امی نے اپنے بھائی ڈاکٹر حنیف کے گھر کا رخ کیا۔ نعیمہ کی امی نے اپنے بھائی حنیف سے اپنی بیٹی کی آنکھوں کے بارے میں بات کی تو اس نے کہا "باجی' آپ نعیمہ کو کل میرے ہسپتال لے آئیں۔ میں اس کی آنکھیں چیک کروا دوں گا"۔

نعیمہ کی دادی روز اپنی بہو سے کہتی کہ نعیمہ کو ہسپتال

حنیف کے پاس لے جاؤ اور اس کی آنکھیں چیک کروا لاؤ۔ لیکن نعیمہ کی ماں گھر کے کام کاج سے وقت ہی نہ نکال پاتی اور یہی سوچتی رہتی کہ کل لے جاؤں گی۔ کل کل کرتے کافی دن گزر گئے۔ جب کہ نعیمہ جب بھی درد کا کہتی اماں نوراں پریشان ہو جاتیں۔

پھر ایک رات نعیمہ کی آنکھوں میں شدید درد ہوا۔ اس کو رات ہی ریڑھے پر بٹھا کر ہسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد بتایا "نعیمہ کی آنکھوں کا مرض اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اب اس کی بینائی واپس نہیں آسکتی اور چار پانچ روز تک یہ اندھی ہو جائے گی"۔

نعیمہ کی ماں نہایت پریشانی کے عالم میں نعیمہ کو لے کر گھر آئی۔ اماں نوراں کو بتایا۔ دادی اماں کو یہ خبر سن کر بہت صدمہ ہوا۔ اب نعیمہ کی دادی اور اس کی امی یہ مشورہ کر رہی تھیں کہ نعیمہ کو یہ بات کیسے بتائی جائے۔ یہی سوچتے ہوئے چار روز اور گزر گئے۔ نعیمہ نے ایک دو دفعہ پوچھا "امی آپ اب مجھے کام پر کیوں نہیں جانے دیتیں؟"

"بیٹا' آپ کی آنکھوں میں درد ہوتا ہے نا اس لیے"

یہ کہہ کر اماں نوراں نے نعیمہ کو ٹال دیا۔ لیکن وہ خود بہت افسردہ تھیں کہ کل نعیمہ بینائی سے محروم ہو جائے گی۔ یہ بھی میری طرح ساری بقیہ عمر آنکھوں کے بغیر ہی گزار دے گی۔ دادی اماں اور نعیمہ کی امی نے نعیمہ کو آج شہر کی سیر کروانے کا پروگرام بنایا۔ مبین اسکول جانے کی تیاری کر رہا تھا اور وہ صبح سورج طلوع ہوتے ہی مبین کے لیے ناشتہ تیار کر کے گھر سے نکل گئیں۔ انہوں نے نعیمہ کو سورج طلوع ہونے کا دل کش منظر دکھایا اور پھر شہر کی طرف چل پڑیں۔ پھر شہر جا کر وہ پارکوں میں گھومیں پھریں۔ اماں نوراں نعیمہ کو کہہ رہی تھیں "بیٹا پھولوں کے رنگ اچھی طرح دیکھ لو اور اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھا لو۔ ذرا غور کی آنکھ سے دیکھو گی تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ گلابی' سرخ' سبز' سفید' پیلے اور نیلے پھول کتنے بھلے لگتے ہیں۔ بیٹی سب رنگوں کو عمر بھر کے لیے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو۔ آسمان کا رنگ دیکھو۔ کتنا پیارا ہے۔ ہلکا سا نیلا"۔

نعیمہ بولی "امی سب کچھ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ پھر مجھے دادی اماں بار بار یہ کیوں کہتی ہیں کہ ان رنگوں کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو۔ آپ کا خیال ہو گا کہ دوبارہ ادھر آنے کے لیے میرے پاس وقت نہ ہو گا۔ ہمارا بھائی جو پڑھ رہا ہے۔ پڑھ لکھ کر جب وہ بڑا آدمی بنے گا تو پھر ہمارے پاس وقت ہی وقت ہو گا۔ پھر ہم روزانہ گاڑی پر سیر کرنے کے لیے نکلا کریں گے۔ شہر آیا کریں گے اور قدرت کے ان حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوا کریں گے"۔

ماں کی آنکھوں میں

آنسو آرہے تھے۔ لیکن وہ اس خوف سے ان کو اندر ہی جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ نعیمہ کو پتا نہ چل جائے کہ وہ بینائی سے محروم ہونے والی ہے۔ "بیٹا! آپ کا بھائی تو پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جائے گا مگر....." وہ یہ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔

ماں نے کہا "بیٹا' آنکھیں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ اس نعمت کی قدر و قیمت کا انسان کو اس وقت احساس ہوتا ہے جب یہ انسان سے چھن جائے۔ اماں نوراں کے پاس بھی چوں کہ یہ نعمت اب موجود نہیں' اس لیے وہ آپ کو اس کا احساس دلا رہی ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے نعیمہ کی امی دل میں یہ سوچ رہی تھی کہ بس اب نعیمہ کو بھی اس نعمت کا احساس ہونے ہی والا ہے۔ یہ بات میں نعیمہ سے کتنی دیر اور چھپا سکتی ہوں۔ بہتر تھا اس کو بتا ہی دیتی۔ لیکن اتنی بڑی بات کیسے کہ دوں۔

اتنے میں نعیمہ کہنے لگی "امی جان' چلو گھر چلیں۔ اندھیرا چھا رہا ہے۔ شام ہو رہی ہے۔ بھائی ہمارا انتظار کر رہا ہو گا"۔

امی بولیں "نہیں نعیمہ بیٹا' ابھی دھوپ ہے۔ دوپہر کا وقت ہے۔ ابھی تو ایک بج رہا ہے۔ آپ کیسے کہہ رہی ہو۔ پھر نعیمہ کی امی نے نعیمہ اور اماں نوراں کو پکڑ کر گھاس پر بٹھا دیا۔ اتنے میں نعیمہ آنکھوں کو ادھر ادھر گھما کر بولی "مجھے تو امی جان کوئی چیز نظر ہی نہیں آرہی۔ نہ آپ کا چہرہ' نہ دادی اماں کی جھریوں بھری پیشانی' نہ سرسبز گھاس اور نہ ہی رنگ برنگے پھول' میں شاید بھی دادی اماں کی طرح بینائی سے محروم ہو چکی ہوں۔ مجھے گھر لے چلو' میں اپنے بھائی مبین کو دیکھنا چاہتی ہوں"۔

نعیمہ کی امی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ پھر سسکیاں بھرتے ہوئے نعیمہ کو تسلی دینے لگیں "بیٹا' قدرت کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ دیکھو اگر آپ پیدائشی نابینا ہوتیں تو پھر آپ دنیا کی کوئی چیز نہ دیکھ پاتیں۔ ماں' بھائی اور دادی اماں کی شکل تک نہ دیکھی ہوتی' نہ ہی رنگوں سے واقف ہوتی"۔

اتنے میں دادی اماں بولیں "شکر کرو نعیمہ' تم نے اپنی آنکھوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ قرآن کے حروف کو جی بھر کر دیکھا۔ تجھے اپنے بھائی' سہیلیوں' والدین اور عزیز' رشتہ داروں کے چہروں کے تاثرات دیکھنے کا موقع ملا۔ پھولوں کو دیکھا' آسمان کو دیکھا' رنگوں کی شناخت اپنے ذہن میں بٹھا لی۔ بیٹا' یاد رکھو جب کوئی شخص کسی ایک عضو یا صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے کسی دوسرے عضو میں زیادہ صلاحیت ڈال دیتا ہے"۔

دادی اماں کی یہ باتیں سن کر نعیمہ کے چہرے پر کچھ خوشی کے اثرات نمایاں ہوئے اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے بھائی مبین کی تعلیم بینائی سے محروم ہو جانے کے باوجود حرج نہیں ہونے دے گی اور اب بھی اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی۔

لیکن پھر وہ اچانک مایوس ہو کر بولی "دادی اماں' اب میں بھی ساری عمر لاٹھی ٹیک کر چلا کروں گی"۔

"ہاں بیٹا' یہ کون سی کوئی بری بات ہے۔ اگر کسی کی ٹانگ نہیں ہوتی تو وہ بھی لاٹھی سے چلتا ہے۔ اگر کسی کی آنکھیں نہیں ہوتیں تو وہ بھی لاٹھی سے چلتا ہے۔ لاٹھی بھی تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے بنائی ہے"۔ اس کے ساتھ ہی دادی اماں نے اپنی لاٹھی نعیمہ کو تھما دی اور خود اپنی بہو کا ہاتھ پکڑ لیا اور تینوں اپنے گھر کی طرف چل پڑیں۔

چند ہفتے تو نعیمہ کو آنکھوں سے محروم ہونے کی وجہ سے کافی وقت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے بڑی پریشانی تو یہ تھی کہ وہ اب اپنے بھائی کو ڈاکٹر نہیں بنا سکے گی۔ مگر انہی چند ہفتوں میں نعیمہ کی کچھ سیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پہلے سے کافی بڑھ گئی۔ اس نے دو ہی ماہ میں اماں نوراں سے کروشیے سے نمازی ٹوپیاں بننے کا کام سیکھ لیا۔ رمضان کے مہینے کا آغاز ہونے والا تھا اس لیے اس کی یہ ٹوپیاں ہاتھوں ہاتھ بکنے لگیں۔ پھر اڑوس پڑوس کے دیہات بھی نعیمہ کے اس ہنر سے واقف ہو گئے۔ اور وہاں سے بھی لوگ یہ

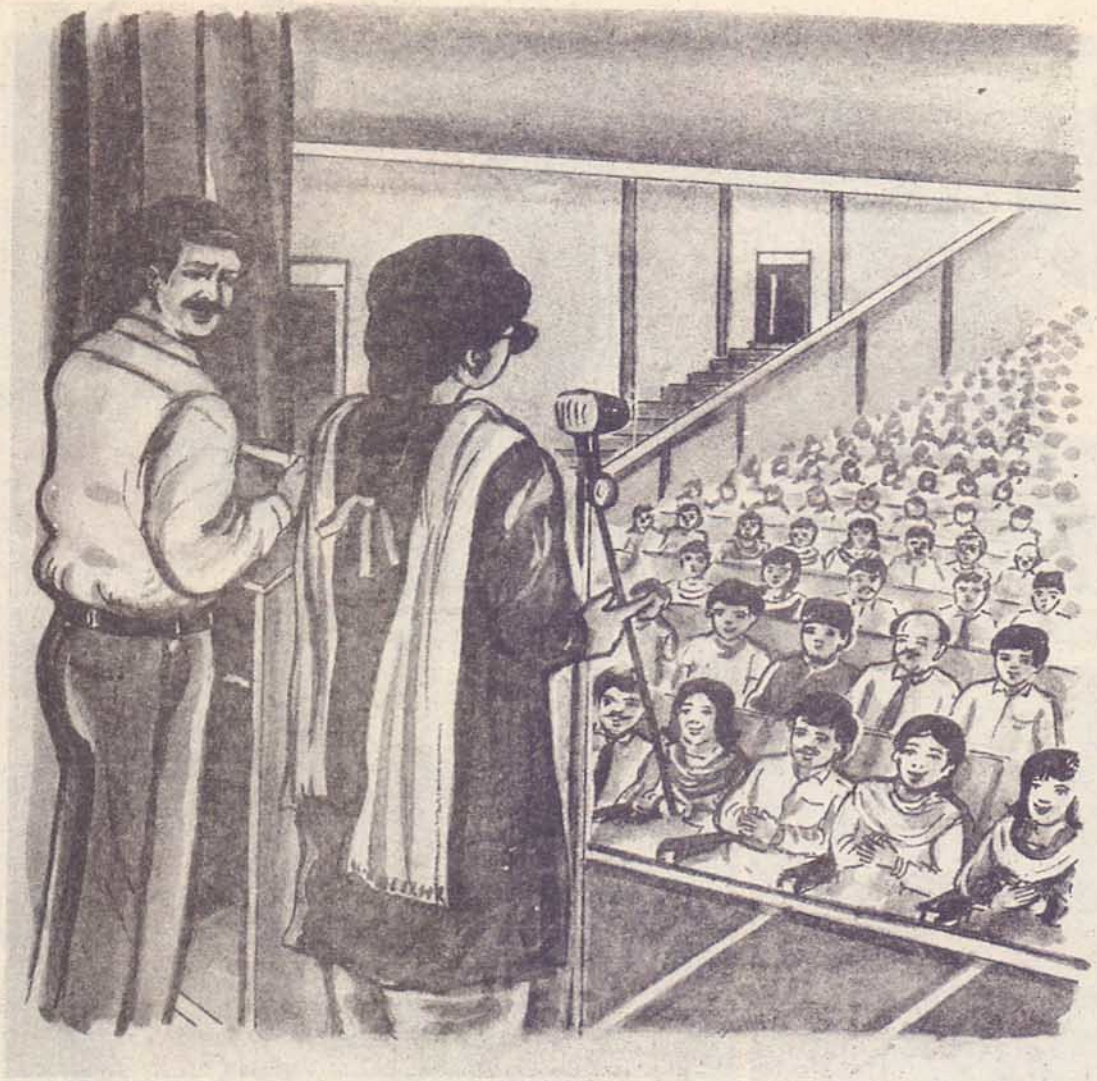

ٹوپیاں خریدنے کے لیے آتے۔ نعیمہ کے آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود اب ان کا گھرانا خوش حال ہونے لگا۔ جب کہ نعیمہ کا بھائی مبین تعلیم کی منزلیں جلدی جلدی طے کرنے لگا۔

وقت یونہی گزرتا رہا اور آج نعیمہ کو بینائی سے محروم ہوئے دس سال گزر گئے تھے۔ نعیمہ کو آج شہر کے ٹاؤن ہال میں ہونے والی تقریب کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ نعیمہ نے اس تقریب میں نہ صرف شریک ہونا تھا بلکہ تقریر بھی کرنی تھی۔ دراصل ملک کے نام ور سرجن نے اس شہر میں سرجیکل ہسپتال کا افتتاح کرنا تھا اور اسی سلسلے میں یہ تقریب منعقد کی گئی تھی۔

نعیمہ ہال میں داخل ہوئی تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جب تالیوں کا شور کم ہوا تو اسٹیج سے ملک کے نام ور سرجن کی آواز بلند ہوئی "خواتین و حضرات! میں آپ کے سامنے ایک تجربہ کار سرجن کی صورت میں موجود ہوں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں سرجن نہیں بلکہ میری یہ اندھی بہن سرجن ہے جو میرے روپ میں آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ جس نے والد کی وفات کے بعد محنت مزدوری کر کے میرے تعلیمی اخراجات پورے کیے اور پھر بینائی سے محروم ہو جانے کے باوجود ہمت نہ ہاری اور مجھے سرجن بنا دیا۔ آج میں تقریر نہیں کروں گا بلکہ میری یہ محترم آپی آپ سے خطاب فرمائیں گی۔ میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اگر ملک و قوم کے لیے جو خدمت میں انجام دینا چاہتا ہوں اس میں رکاوٹ کا خدشہ نہ ہوتا تو آج میں اپنی دونوں آنکھیں اپنی بہن کو عطیہ کر دیتا"۔ یہ کہتے ہوئے سرجن ڈاکٹر مبین کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو آنکھوں سے چھلک پڑے۔

اور پھر اس کے بعد نعیمہ کو تقریر کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ہر طرف سے یہ آوازیں آ رہی تھیں "ڈاکٹر صاحب، ہماری آنکھیں لے لیں، ہم آنکھوں کا عطیہ دیتے ہیں۔ لوگوں کی آنکھوں میں خوشی اور جذبہ ایثار کے آنسو تھے۔ وہ ملک کی اس عظیم بہن پر نچھاور ہونے کے لیے تیار تھے، جس نے ملک کو اتنا قیمتی سرمایہ فراہم کیا تھا۔

ڈاکٹر مبین کی بہن بھیگی آنکھوں کے ساتھ مائیک کے سامنے آئیں اور یہ کہہ کر آنکھوں کا عطیہ لینے سے انکار کر دیا کہ مجھے آنکھوں سے محروم ہو کر اس نعمت کی عظمت کا جو احساس ہوا ہے میں دوبارہ اس احساس سے محروم نہیں ہونا چاہتی۔

کارٹون کہانی

شاہد ریاض شاہد

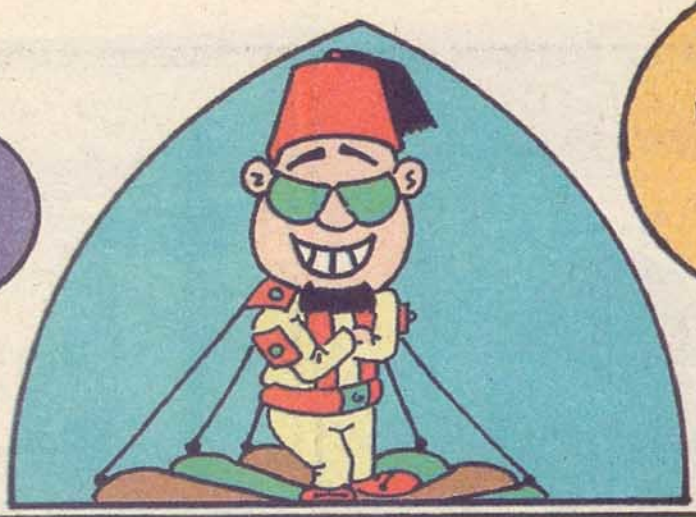

ملا نصر الدین کی پیراشوٹ جمپ

1
ایک دن ملا نصر الدین نے ٹیلی وژن لگایا۔ وہاں کھیلوں کے پروگرام میں پیراشوٹ جمپ کے مظاہرے کا اعلان ہوا۔
ناظرین اب آپ پیراشوٹ کا مظاہرہ دیکھیں گے

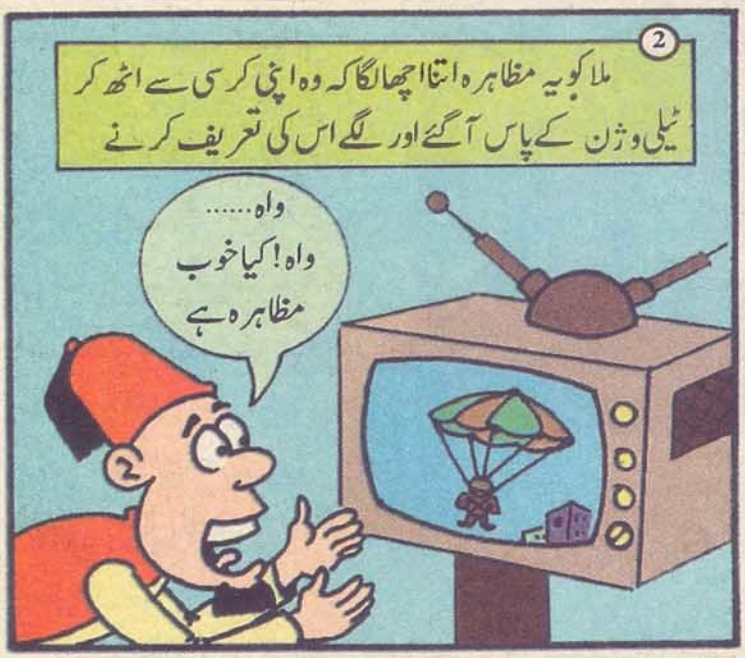

کاش..... میں پیراشوٹ کے ذریعے بلندی سے نیچے کود سکوں
3
پروگرام ختم ہوا تو ملا جی دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ کاش میں بھی ایسا کمال دکھا سکوں۔

5
چھتری لے کر ملا جی اپنے گھر کی بالائی منزل پر چڑھ گئے اور چھلانگ کا ایکشن بنا کر کھڑے ہو گئے.....
یہاں سے لگاتا ہوں جمپ
6
پھر ملا جی نے جمپ لگا دی۔ ایک دو سیکنڈ تک تو ملا کو خوب مزہ آیا
ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا
مگر چھتری تو آخر چھتری ہوتی ہے۔ ہوا یوں کہ چھتری ملا جی کا وزن برداشت نہ کر سکی۔
7
یہ دیکھ کر ملا سخت بوکھلا گئے۔
8
پھر آن کی آن میں وہ لمحہ بھی آگیا جب ملا کو اپنی نادانی کی سزا مل گئی۔ ملا اپنی ناقص پیراشوٹ یعنی چھتری سمیت زمین پر دھڑام سے گر پڑے اور لگے چیخنے چلانے
اوئی میری ٹانگ گئی..... آئی میری کمر..... کوئی ہے؟ کوئی پکڑے مجھے...

ڈاکٹر ہارڈی تجربہ گاہ میں اپنے کام میں مصروف تھے کہ جوزف کے کمرے سے اس کی چیخ سنائی دی۔ ڈاکٹر ہارڈی تیزی سے اس طرف دوڑے اور انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ جوزف بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر ہارڈی کو دیکھا تو دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔ ڈاکٹر نے جوزف کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بڑی محبت سے اسے تسلی دی "بیٹے! ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم تو بہت بہادر ہو۔ کیا تم نے آج پھر وہی خواب دیکھا ہے؟"

جوزف نے سر ہلاتے ہوئے ڈاکٹر کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا "وہی، بالکل ویسا ہی ڈراؤنا پارک..... اندھیرا اور....."

ڈاکٹر نے جوزف کو اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا "تو یہ خواب ہی تو ہے حقیقت تو نہیں۔ مت ڈرو۔ چلو تھوڑی دیر کے لیے اپنی ممی کے پاس جا کر لیٹ جاؤ۔ میں اپنی چیزیں سمیٹ کر تمہارے پاس آتا ہوں"۔

جوزف کو ڈاکٹر ہارڈی کے پاس آئے بارہ سال ہو چکے تھے۔ اپنے ملک میں خوفناک جنگ کے بعد وہ اپنے والدین سے بچھڑ گیا تھا۔ امدادی کام کرنے والی ایک تنظیم نے جب پرورش کے لیے اسے ڈاکٹر ہارڈی کے سپرد کیا تو اس کی عمر تین سال سے بھی کچھ کم تھی۔

ڈاکٹر ہارڈی اور ان کی بیوی نے جوزف کو بالکل اپنی اولاد کی طرح پالا۔ اسے اتنا پیار دیا کہ شاید اس کے اپنے ماں باپ بھی نہ دے سکتے۔ لیکن اتنا پیار دینے کے باوجود انہوں نے جوزف سے کبھی یہ بات نہ چھپائی کہ وہ اس کے اصلی ماں باپ نہیں۔ جوزف یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس کے ماں باپ نہیں ہیں ان سے ماں باپ کی طرح ہی محبت کرتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اکثر یہ سوچتا تھا کہ اس کے اصلی ماں باپ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ زندہ ہیں یا مر چکے ہیں؟ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اس کا اصلی نام کیا تھا۔ اس کے اور بہن بھائی تھے یا نہیں؟ وہ کہاں رہتا تھا اور ڈاکٹر ہارڈی کے پاس کیسے آیا؟

یہ خیالات اکثر جوزف کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر ہارڈی نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح جوزف کے والدین یا دوسرے رشتہ داروں کا پتا چل جائے لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ کامیابی بھی کیسے ہوتی، اس کا تو پورا شہر جنگ میں تباہ ہو گیا تھا۔ آدھے سے زیادہ لوگ جنگ کے شعلوں میں بھسم ہو گئے تھے۔ جو باقی بچے وہ اپنی جان بچا کر جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگ نکلے تھے۔

ایک دن جوزف اچانک جاگا۔ وہ بہت خوف زدہ تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے سرہانے رکھا ہوا لیمپ جلایا۔ تھوڑی دیر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور سردی کے باوجود پسینے آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ اسے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ بھاگ کر ڈاکٹر ہارڈی کے کمرے میں چلا جائے لیکن اس نے پھر ہمت سے کام لیا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ اس خواب کے بعد سے جوزف کی نیند بہت کم ہو گئی۔ کچھ دن گزرے تو وہ اس خواب کو تقریباً بھول گیا لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی سوتے میں اسے اس کا خیال آتا اور وہ گھبرا کر جاگ جاتا۔ پھر نیند بڑی مشکل سے آتی۔ کچھ دن اسی طرح گزرے اور اب بہت دن کے بعد اسے پھر وہی

خواب دکھائی دیا۔ بالکل وہی ہر بات اور ہر چیز اسی طرح۔ ڈاکٹر ہارڈی کے کہنے سے جوزف اس کے کمرے میں چلا گیا تھا اور ڈاکٹر ہارڈی بھی تجربہ گاہ میں تالا لگا کر اپنے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ ان کی بیوی آدھی جاگی اور آدھی سوئی ہوئی جوزف کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ڈاکٹر ہارڈی نے بات شروع کرتے ہوئے کہا "جوزف! بس سال ڈیڑھ سال کی بات اور ہے۔ تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا"۔

جوزف نے ذرا حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کون سا مسئلہ ڈیڈی؟ میں سمجھا نہیں"۔

"ڈاکٹر ہارڈی نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے بولے "ابھی تک اونگھے جا رہی ہو۔ ہمیں دیکھو ساری رات تجربہ گاہ میں گزار دی۔ اب تو جاگو صبح ہونے والی ہے"۔

بیوی نے ایک زوردار جماہی لی اور کونے میں رکھی ہوئی بجلی کی کیتلی کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں "تمہیں تو دراصل خبط ہو گیا ہے۔ دن رات تجربہ گاہ میں گھسے رہتے ہو۔ پھر بھی کچھ ہاتھ نہیں آ رہا۔ کئی سال تو ہو گئے"۔

ڈاکٹر ہارڈی چائے بنانے میں بیوی کا ہاتھ بٹانے لگے اور کہنے لگے "محترمہ! سائنسی تحقیق میں چند برسوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ کبھی گتھی آسانی سے سلجھ جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دیوار سے ٹکرانے کی نوبت آجاتی ہے لیکن بات بگڑتی ہی چلی جاتی ہے۔ تمہیں یہ بتا دوں کہ میری طرح اور کئی سائنس دان بھی اسی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں لیکن ابھی تک وہ بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ سال ڈیڑھ سال میں میں سائنس کی دنیا میں ایک زبردست ایجاد کا اضافہ کروں گا"۔

جوزف جو اپنا خواب تھوڑی دیر کے لیے بھول کر بڑی دلچسپی سے میاں بیوی کی باتیں سن رہا تھا اچانک بول پڑا "ڈیڈی! آپ میری بات تو ٹال ہی گئے۔ بتائیے میرا کیا مسئلہ ہے اور آپ اسے کس طرح حل کریں گے؟"

"وقت آنے پر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ابھی وقت نہیں آیا۔ ابھی تو میں نے تمہاری ممی کو بھی کچھ نہیں بتایا، کسی کو بھی نہیں۔ بس تھوڑا سا انتظار کر لو" ڈاکٹر ہارڈی نے بات ٹال دی اور مزے لے لے کر چائے پینے لگے۔ اس دن کے بعد سے جوزف کچھ پریشان رہنے لگا اور اس کی صحت بھی بگڑنے لگی۔

آنکھ جھپکتے سال گزر گیا۔ اس دوران میں جوزف نے پھر وہی خواب دیکھا۔ لیکن اس بار وہ شکلیں اور بھی صاف نظر آئیں جو ہر بار اسے خواب میں دکھائی دیتی تھیں۔ تین چار مہینے اور گزرے ہوں گے کہ ایک دن ڈاکٹر ہارڈی نے جوزف سے کہا "پیارے بیٹے، جب اسکول سے واپس آؤ تو مجھ سے تجربہ گاہ میں مل لینا۔ ضروری کام ہے"۔

جوزف نے "بہت اچھا" کہا اور بائی سکل کی گھنٹی بجاتا ہوا اسکول کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسکول سے واپس آتے آتے جوزف ڈاکٹر ہارڈی کی بات بھول چکا تھا لیکن ڈاکٹر سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے آتے دیکھا تو پکار کر کہا "آ گئے میرے بیٹے، تھوڑا آرام کر لو تو میرے پاس آنا"۔

جوزف نے اندازہ لگایا کہ ڈاکٹر ہارڈی کو کوئی بہت ہی ضروری کام ہے۔ لہٰذا وہ سیدھا تجربہ گاہ میں چلا گیا۔ ڈاکٹر اسے دیکھ کر بولے "آ گئے نوجوان! میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ آرام بھی نہ کرو۔ خیر اب آ ہی گئے ہو تو ادھر بیٹھ جاؤ، اس بڑی کرسی پر"۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر ہارڈی دروازے کی طرف بڑھے اور اسے بند کر کے انہوں نے تالا لگا دیا۔ پھر وہ میز کی دراز میں کچھ تلاش کرنے لگے۔ اس دوران میں وہ کنکھیوں سے جوزف کو دیکھتے جاتے تھے لیکن بالکل خاموش تھے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے ایک کاغذ نکالا اور جوزف سے کچھ دور میز کے ایک سرے پر بیٹھ گئے۔ وہ کبھی اس کاغذ پر نظریں جما دیتے اور کبھی جوزف کے چہرے پر۔ جوزف ان کی ان باتوں پر اپنی حیرانی ظاہر کرنے ہی والا تھا کہ وہ بولے "یہ وقت اس تجربہ کے لیے اس لیے بہت مناسب ہے کہ تمہاری ممی ورزش کی کلاس میں شرکت کے لیے گئی ہوئی ہیں"۔

"کیسا تجربہ ڈیڈی؟" جوزف نے پریشان ہو کر کہا۔

ڈاکٹر ہارڈی نے منہ پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولے "صبر سے کام لو۔ بس چند گھنٹے کی بات ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں وہ خواب یاد ہے جسے دیکھ کر تم ڈر جاتے تھے؟"

جوزف نے چونک کر کہا "جی خوب اچھی طرح یاد ہے"۔

ڈاکٹر نے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے کہا "شاباش"

کچھ دیر تجربہ گاہ میں خاموشی رہی اور ڈاکٹر نے پھر بولنا شروع کیا "تم یہ فریم دیکھ رہے ہو جو سامنے لگا ہے؟ وہ جس کے بیچ میں ایک سیاہ دائرہ ہے"۔

جوزف نے اس طرف دیکھا اور بولا "جی ہاں بالکل صاف نظر آرہا ہے"۔

ڈاکٹر نے ایک گولی جوزف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ گولی اس پانی سے نگل لو جو تمہارے پاس تپائی پر رکھا ہے۔ اس کے بعد یہ کرو کہ اس سیاہ دھبے کی طرف دیکھو۔ اس پر پوری طرح نظریں جمادو اور دیکھو میں یہ تاریں جو تمہارے سر میں لگا رہا ہوں ان سے گھبرانا نہیں۔ اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تم یقین کرو کہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ نہ صرف تمہاری بھلائی کے لیے ہے بلکہ ساری انسانیت کے فائدہ کے لیے ہے۔ ڈر تو نہیں رہے؟"

جوزف خاصا خوف زدہ تھا لیکن اس نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے کہا "نہیں، جو آپ کہیں گے کروں گا"۔

ڈاکٹر ہارڈی نے ایک آلے کے ذریعے تاروں کو جوزف کے سر میں لگایا اور دوسرا سرا کمپیوٹر میں لگا دیا۔ اس طرح جوزف کے دماغ کے اس حصہ کا رابطہ کمپیوٹر سے قائم ہو گیا جس کا تعلق بصارت یعنی دیکھنے سے ہے۔ اب ڈاکٹر ہارڈی نے آہستہ آہستہ جوزف سے کہنا شروع کیا "جوزف میرے بیٹے! اب تم یاد کرو کہ تم نے خواب میں کیا کیا دیکھا تھا۔ بالکل ترتیب سے پورا خواب اپنے ذہن میں لاؤ۔ ہاں بیٹے شاباش۔ تمہیں یاد آیا؟"

جوزف پر جیسے بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سر ہلاتا رہا اور بالکل خاموش رہا۔ ادھر ڈاکٹر نے سرگوشی کے انداز میں اپنی بات جاری رکھی "یاد کرو۔ پورا خواب شاباش"۔

پھر ڈاکٹر ہارڈی نے اس آلہ کی طرف دیکھا جس کے تار جوزف کی کھوپڑی اور کمپیوٹر سے لگے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اور اس نے بڑے اطمینان سے کہا "ظاہر میں تو سارا کام ٹھیک ہی ہو رہا ہے"۔ پھر اس نے آلے کے کچھ بٹن دبائے اور سامنے پڑے ہوئے اسٹول پر آرام سے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک نظر آلے پر ڈالی اور پھر کمپیوٹر میں اسکرین پر کچھ دیکھتا رہا۔ اپنا اطمینان کر لینے کے بعد اس نے جوزف کی کھوپڑی میں لگے ہوئے تار نکال دیئے۔ ابھی وہ اپنا کام مکمل نہ کر پایا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا تو اس کی بیوی کھڑی تھی۔ اس نے جوزف کو بے ہوش بیٹھے دیکھا تو ایک دم خوف زدہ ہو کر بولی "تو آخر کر لیا تم نے اپنا تجربہ۔ یہ کیا حالت بنا دی ہے میرے بچے کی"

ڈاکٹر ہارڈی نے بڑے اطمینان سے کہا "یہ مت بھولو کہ جوزف کو تم جتنا چاہتی ہو اس سے کم میں بھی نہیں چاہتا۔ ابھی تھوڑی دیر میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا اور پھر ہم سب مل کر اسکرین پر وہ خواب دیکھیں گے جو میں نے اس کے دماغ سے کمپیوٹر میں ریکارڈ کر لیا ہے"۔

ہارڈی کی بیوی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور جوزف کو تکنے لگی۔ تھوڑی دیر میں جوزف کو ہوش آگیا تو ڈاکٹر ہارڈی نے اس سے کہا "جوزف اب میں تمہیں اور تمہاری ممی کو ایک موووی دکھاتا ہوں۔ شاید تمہیں پسند آئے"۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر نے کمپیوٹر کے بٹن دبائے اور کمپیوٹر اسکرین پر موووی شروع ہو گئی۔

"جوزف ایک پارک میں جھیل کے کنارے بیٹھا بطخوں کو روٹی کے ٹکڑے کھلا رہا ہے۔ وہ بہت خوش ہے اور اس ماحول میں اسے بہت مزا آرہا ہے۔ اچانک گولیاں چلنے اور دھماکوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ آگ لگی ہے۔ ہر طرف دھواں اور شور ہے۔ جوزف نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک میزائل آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ وہ کبھی کسی درخت کے پیچھے اور کبھی کسی ستون کے پیچھے چھپتا ہے لیکن جونہی وہ کسی آڑ کے پیچھے سے نکلتا ہے وہ میزائل پھر اس کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ اتنے میں ایک عورت اسے میزائل سے بچانے کے لیے اپنی آڑ میں لے لیتی ہے اور میزائل اس عورت کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے لیکن جوزف بچ جاتا ہے۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ چیختے ہیں، بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ"۔

مووی ختم ہوئی تو جیسے جوزف پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر کچھ سنبھلا تو ممی سے لپٹ گیا اور اس نے صرف اتنا کہا "ممی! ایک ایک بات ٹھیک وہی ہے۔ سب باتیں سچی ہیں۔ ذرا سا فرق نہیں لیکن یہ کیسے ہوا؟ کہیں میں ایک اور خواب تو نہیں دیکھ رہا"۔

اگلے چند دن میں یہ خبر پورے شہر میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں پھیل چکی تھی اور کانفرنس ہال میں ڈاکٹر روبرٹ ہارڈی اخباری نمائندوں کو بتا رہے تھے "بعض خواب جو بار بار دکھائی دیتے ہیں ان کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اکثر یہ خواب اس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان میں گزرے ہوئے زمانے یا آنے والے زمانے کی سچائی ہوتی ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ خواب بعض دفعہ ذہنی اور جسمانی صحت پر برا اثر ڈالتے ہیں اور ہمارے دماغ سے نکالے نہیں نکلتے۔ جوزف بیسویں صدی کے آخر میں ایک ہولناک جنگ کی وجہ سے اپنے عزیز و اقارب سے محروم ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف 3 سال تھی۔ اب جب کہ 14 برس کا ہو گیا ہے مگر جنگ کے خوف ناک خواب اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اب کبھی اسے ایسے ڈراؤنے خواب نہیں آئیں گے۔ میرے اس تجربے کا مقصد بھی یہ تھا کہ لوگوں کو ایسے خوف ناک خوابوں سے چھٹکارا دلا دیا جائے جو ان کے دماغ میں گھس کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان خوابوں کے کمپیوٹر میں منتقل ہو جانے کے بعد انسان کا ان سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ اس طرح ہمارے پاس بہت سے دل چسپ خواب محفوظ ہو جائیں گے۔ جن میں خوشگوار واقعات ہوں گے اور ایسی ہستیوں کی شکلیں اور باتیں محفوظ رہیں گی جو ہمیں بہت پیاری تھیں لیکن اب ہم سے بہت دور جا چکی ہیں۔ اب کچھ دن بعد میں یہ تجربہ چند اور لوگوں پر دہراؤں گا۔ فی الحال مجھے یہ انتظار ہے کہ میں جوزف پر اپنے تجربہ کا اثر اچھی طرح دیکھ لوں"۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر ہارڈی نے پاس بیٹھے ہوئے جوزف کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی پیلاہٹ سرخی میں بدل چکی تھی۔ اخباری نمائندے مووی دیکھ کر اور ڈاکٹر ہارڈی کی باتیں سن کر حیران ضرور تھے لیکن انہیں ڈاکٹر کی باتوں پر سو فی صد یقین تھا۔ کیوں کہ ڈاکٹر ہارڈی کا طبی اور نفسیاتی تحقیق کے سلسلہ میں بڑا نام تھا۔

اخباری کانفرنس کے دوسرے ہی دن صبح ڈاکٹر ہارڈی کے پاس ایک اخباری نمائندے کا فون آیا۔ اس نے کہا "میں اپنے بھائی سے ملاقات کے لیے آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گے؟"

"بھائی؟ کون بھائی؟" ڈاکٹر ہارڈی نے حیرت سے پوچھا۔

جواب ملا "جوزف جسے آپ نے اولاد کی طرح پالا ہے"۔

ڈاکٹر ہارڈی اور زیادہ حیران ہو گئے اور بولے "تمہیں کیسے معلوم ہے کہ جوزف تمہارا بھائی ہے؟"

ادھر سے مختصر جواب آیا "باقی باتیں ملاقات کے وقت ہوں گی۔ میں آ رہا ہوں"۔

ڈاکٹر ہارڈی بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کی بیوی اور جوزف صوفے پر بیٹھے تھے۔ گھنٹی بجی اور دروازہ کھلتے ہی ایک جوان آدمی جوزف کی طرف بڑھا اور اسے گلے لگاتے ہوئے بولا "تیرہ چودہ سال کی جدائی کے بعد میں اپنے پیارے بھائی کو سینے سے لگا رہا ہوں۔ میرا منا سا بھائی جسے میں گود میں کھلاتا تھا"۔

یہ کہہ کر اجنبی نے جوزف کے ماتھے کو چوما اور پھر کوٹ سے ایک تصویر نکال کر ڈاکٹر ہارڈی کی طرف بڑھا دی۔ ڈاکٹر نے یہ تصویر دیکھی تو اچھل پڑے۔ یہ تو وہی عورت ہے جس نے خواب میں جوزف کو میزائل سے بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی تھی۔ ڈاکٹر نے اجنبی سے کچھ نہ کہا۔ تصویر بیوی کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑی دھیمی آواز میں یوں بولے، جیسے خود سے باتیں کر رہے ہوں "بالکل سچ ہے۔ بالکل سچ۔ جوزف ماں سے بچھڑا تو اتنا چھوٹا تھا کہ کچھ دن میں اس کی شکل بھول گیا۔ لیکن یہ شکل اس کے ذہن کے ایک حصے میں محفوظ رہی اور مصیبت کے وقت وہ شکل اس گوشے سے نکل کر پھر اس کے شعور میں آ گئی"۔

ڈاکٹر ہارڈی نے جوزف کی طرف دیکھا جو ممی کے ہاتھ سے تصویر لے کر اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ڈاکٹر نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بڑے کھوئے کھوئے انداز میں کہا "ماں سے زیادہ اولاد کا محافظ بھلا کون ہو سکتا ہے۔ چاہے وہ خواب ہو یا حقیقت"۔

آخر کار وہ دن آن پہنچا جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا۔ اپنے اس گناہ کو دھونے کا دن، جس نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ جس گناہ کی تکلیف ہر لمحے اسے کھا رہی تھی۔ جس کا پچھتاوا اس کی زندگی کا روگ بن گیا تھا۔ وہ اپنی کلہاڑی کو ایک ہاتھ سے دوسرے میں اچھالتا، اپنے دشمن کی تلاش میں آگے بڑھ رہا تھا۔ کلہاڑی وہی تھی اور اس کا پھل بھی اسی طرح چمک رہا تھا، جس طرح کوئی آٹھ نو برس پہلے چمک رہا تھا۔ اس دن لالچ میں آکر اس نے ایک ایسا گناہ کر ڈالا تھا جس کی تلافی آج اسے کرنا تھی۔ وہ لالچ بھی کوئی چھوٹا موٹا نہیں تھا، بہت ہی بڑا لالچ تھا۔ اسے آزاد کر دینے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ اس کے مالک نے کہا تھا "اگر تم نے دشمن کے اس بہادر شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد!"

اس کے لیے یہ پیش کش بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اس کے تو باپ دادا اور ان سے بھی پچھلی کئی پشتوں نے صرف ایک ہی کام کیا تھا، یعنی لوگوں کی غلامی۔ آزادی تو ان کے تصور میں بھی نہیں تھی۔ وہ ان بدنصیب لوگوں میں شمار ہوتا تھا جن کی زندگی ان کے مالک استعمال کرتے تھے اور اب اس کے مالک نے اسے آزادی جیسی نعمت کی پیش کش کر دی تھی۔ لیکن اس کے بدلے اسے جو کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا، وہ بھی کوئی چھوٹا موٹا کام نہیں تھا۔ وہ تھا دشمن کے سب سے بہادر شخص کا قتل۔ اس میں اس کی اپنی جان بھی جا سکتی تھی۔ مگر آزادی جیسی قیمتی چیز کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا۔ تبھی لالچ میں آکر اس نے اس مشکل کام کو کرنے کی پیش کش قبول کر لی تھی۔ ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جس نے اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔ بلکہ وہ اسے ایک رحم دل اور بہت ہی نیک شخص کے طور پر جانتا تھا۔

آج اس واقعے کو کئی برس گزر گئے تھے لیکن اسے اس دن اور آج کے دن میں کوئی فرق نہیں لگ رہا تھا۔ وہی میدان جنگ، وہی آہ و پکار، وہی گھوڑوں کی سرپٹ دوڑ، وہی چاروں طرف خون ہی خون! فرق صرف یہ تھا کہ اس دن جس گروہ کے ایک بہادر شخص کو قتل کیا تھا یہ غلام آج اسی گروہ کا دوست اور وفادار سپاہی بن چکا تھا، اور انہی کی طرف سے دشمنوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ آج جب اسے یہ پیغام ملا تھا کہ دشمن کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ہے اور اسے بھی اس میں شریک ہونا ہے تو اس کے جسم میں ایک سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس نے فوراً جنگ کی تیاری شروع کر دی اور اپنی کلہاڑی، نیزے اور تیر کمان کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ اسے یہ احساس ضرور تھا کہ اس کے جسم کی چستی اور اس کا نشانہ اس دن جیسا نہیں رہا جس دن اس نے اس بہادر اور بے گناہ شخص کو قتل کیا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ ایک ہی وار میں دشمن فوج کے سردار کی گردن تن سے جدا کر سکتا ہے۔

اسے رہ رہ کر وہ دن یاد آ رہا تھا جب آج سے آٹھ نو مہینے پہلے اس نے ایک معرکے میں اپنی غلامی کو آزادی میں تبدیل کرنے کے لیے اپنی اسی کلہاڑی کو تیز کیا تھا اور پیدل فوج کے ساتھ چلتا ہوا اس مقام کی طرف بڑھنے لگا تھا جہاں اس کا اور دشمن فوج کا آمنا سامنا ہونا تھا۔ جنگ بہت زور دار طریقے سے شروع ہوئی تھی۔ پہلے تو اس نے دیکھا کہ اس کی اپنی فوج کے سپاہی پسپا ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ کئی تو آن کی آن میں دشمن کے اس بہادر شخص کی تلوار کا نشانہ بن گئے ہیں جسے اس نے اپنی کلہاڑی کا نشانہ بنانا تھا۔ لیکن بازی جلد ہی پلٹ گئی تھی۔ دشمن فوج سے ایک ایسی غلطی ہو گئی تھی

جس سے وہ گھیرے میں آگئی تھی۔ لیکن اس بہادر شخص نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ مسلسل لڑ رہا تھا اور اپنی تلوار سے دھڑا دھڑ دشمنوں کو ڈھیر کر رہا تھا۔ وہ اکیلا ہی بیسیوں پر بھاری تھا۔ مگر اس غلام کے لیے امید پیدا ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس درخت کی جانب بڑھ رہا تھا جس کے پیچھے اس بہادر شخص نے گھات لگا رکھی تھی۔ اسے جنگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آیا تھا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ اس بہادر شخص کو قتل کر کے اپنے مالک سے آزادی حاصل کر لے۔ اسی دوران میں وہ بہادر شخص ایک سپاہی سے لڑتے ہوئے بالکل اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ غلام بڑی پھرتی سے درخت کے پیچھے سے نکلا تھا اور وار کر دیا تھا۔ وہ غلام ہی نہیں ایک مانا ہوا نشانے باز بھی تو تھا۔ اس کا نشانہ آج تک نہیں چوکا تھا۔ لیکن آج نجانے اس کے ہاتھ میں کیوں لرزش آگئی تھی کہ اس کا نشانہ تھوڑا سا چوک گیا۔ اس نے وار اس بہادر شخص کی گردن پر کرنا چاہا تھا جب کہ نشانہ اس کے پیٹ پر لگا تھا۔ لیکن یہ بھی مہلک ثابت ہوا تھا اور وہ بہادر شخص زمین پر گر پڑا تھا۔ اس نے دوبارہ اٹھ کر اس غلام کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن اس کی ٹانگوں نے ساتھ نہ دیا اور وہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

آج اتنے برس گزرنے کے باوجود اس بہادر شخص کے وہ الفاظ اس کے کانوں میں ابھی تک گونج رہے تھے، جو اس نے شدید زخمی ہوتے وقت کہے تھے۔ اس نے کہا تھا: "وحشی! تم....."

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، روح اس کے جسم سے پرواز کر چکی تھی۔ یہی وہ الفاظ تھے جو اس غلام کی روح سے چمٹ گئے تھے۔ اسے محسوس ہوتا کہ یہ الفاظ اس سے سوال کر رہے ہیں کہ مجھے کس جرم کی سزا میں مارا گیا، میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟

یہ کئی برس پہلے کا واقعہ تھا جو رہ رہ کر اس کے ذہن میں آرہا تھا۔ اس نے ان پرانی یادوں کو بڑی مشکل سے ذہن سے اتارا اور جنگ کے میدان میں چاروں جانب نظر دوڑائی۔ اسے دشمن فوج کا سردار دور کھڑا نظر آیا جو اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ آج وہ پہلے کی طرح چھپ کر دشمن پر حملہ آور نہیں ہو گا بلکہ کھلے عام لڑے گا۔ چاہے اس میں اس کی اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ کیوں کہ آج وہ اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے آیا تھا۔ وہ گناہ جو اس نے ایک نیک اور بہادر شخص کو محض آزادی حاصل کرنے کے لالچ میں آکر قتل کر کے کیا تھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ دشمن سردار کو للکارتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ دشمن سردار کے دو محافظ اسے للکارتے دیکھ کر اس کی جانب بڑھے لیکن اس نے کلہاڑی سے ایسے ہاتھ دکھائے کہ دونوں زمین پر تڑپتے نظر آئے۔

اب اس کے سامنے وہ سردار تھا جسے مار کر وہ اپنے گناہوں کا بوجھ ہلکا کر سکتا تھا..... جونہی موقع ہاتھ آیا، اس کی کلہاڑی فضا میں بلند ہوئی اور اگلے ہی لمحے نیچے دشمن سردار کی گردن کو چیر کر رکھ دیا۔ ساتھ ہی اسے اپنے سینے پر رکھا گناہوں کا بھاری پتھر سرکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے خوشی کا نعرہ مارا..... میں نے مسیلمہ کو قتل کر دیا۔ یہ وہی مسیلمہ تھا جس نے حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد نبی ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ مسیلمہ کو جہنم رسید کرنے والا، اپنے گناہ کا بدلہ چکانے والا یہ شخص وحشی بن حرب تھا۔ یہ وہی صحابی تھے جنہوں نے کفر کی حالت میں جنگ احد کے دن حضور اکرمؐ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے بدلے انہیں ان کے مالک نے آزادی کا لالچ دیا تھا۔ یہی وہ گناہ تھا جس نے وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے لیے قابل نفرت شخص بنا دیا تھا اور فتح مکہ کے وقت وہ ان گنے چنے افراد میں شامل تھے جنہیں حضورؐ نے قتل کر دینے کا حکم دے دیا تھا۔ لیکن جب آپ نے اسلام قبول کر لیا تو حضورؐ نے آپؓ کو معاف کر دیا تھا۔ ساتھ ہی آپؐ نے یہ بھی کہا تھا کہ وحشی میرے سامنے نہ آیا کرو کیوں کہ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنے پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی یاد ستانے لگتی ہے۔

پس اسی دن سے وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے جس طرح انہوں نے مسلمانوں کے دلوں کو ٹھیس پہنچائی تھی اسی طرح وہ اس گناہ کی تلافی بھی ایک نہ ایک دن ضرور کریں گے اور آج وہ دن آگیا تھا۔ مسلمانوں کا انتہائی سخت دشمن، ایک نہایت جھوٹا اور بے ایمان شخص مسیلمہ کذاب حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔

دُنیا کا بُلند ترین مجسّمہ

شہناز خان

اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارا پروگرام امریکا کی سیر کا بنا۔ امریکا کے مشہور شہر نیو یارک میں میرے چچا ایک فرم میں اونچے عہدے پر فائز ہیں۔ ہم نے اپنے چچا کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ ہم آپ کے پاس سیر کے لئے آرہے ہیں۔

ہمارا پاکستان سے امریکا کا ہوائی سفر بڑا خوش گوار رہا۔ شام کے سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں جب طیارے میں اعلان ہوا کہ ہم چند منٹ بعد نیویارک کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ پھر ایک ہلکے سے جھٹکے سے رک گیا۔

ہوائی اڈے پر ہمارے چچا استقبال کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں گاڑی میں بٹھایا اور ہم آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد گھر پہنچ گئے۔ ہم سب اپنی چچی اور چچا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ رات کو ہم چند گھنٹے ہی سوئے ہوں گے۔ باقی کی تمام رات باتوں میں گزر گئی۔ اگلے روز نیو یارک کی سیر کا پروگرام بنا۔ ہم سب بچے اور بڑے گاڑی میں بیٹھ کر نیو یارک کی سیر کو نکل گئے۔ چچا نے کہا "بچو! سب سے پہلے ہم آپ کو مجسمہ آزادی دکھائیں گے۔ جسے دیکھ کر یقیناً آپ سب بہت حیران ہوں گے"۔

گاڑی کو فیری ٹرمینل پر پارک کر دیا گیا اور ہم ایک نہایت دل فریب اور خوب صورت بوٹ میں بیٹھ کر "لبرٹی آئی لینڈ" پہنچ گئے۔ جہاں آزادی کا مجسمہ نصب ہے۔ ہم نے مجسّمے کی ایک لفٹ کے ذریعے خوب سیر کی اور واقعی اس کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ واپسی پر آتے ہوئے میں نے چچا جان سے سوال کیا "چچا جان، کیا آپ ہمیں اس مجسّمے کے متعلق کچھ تفصیل نہیں بتائیں گے؟"

چچا جان نے کہا "کیوں نہیں بیٹا، میں آپ کو گھر پہنچ کر اس کے متعلق سب کچھ بتاؤں گا۔ تم لوگ یہ کہانی سن کر اس سے بھی زیادہ حیران ہو گے۔ جتنا اب اسے دیکھ کر ہوئے ہو"۔

گھر پہنچ کر چچا جان نے ہمیں جو تفصیلات اس مجسّمے کے متعلق بتائیں وہ واقعی اتنی دل چسپ اور حیران کن تھیں کہ میں نے وہیں ارادہ کر لیا تھا کہ واپس پاکستان پہنچ کر اپنے دوستوں کو ضرور سناؤں گا۔ اب میں پاکستان پہنچ چکا ہوں اور اپنا وہ ارادہ پورا کر رہا ہوں۔ یعنی آپ کو مجسمہ آزادی کی کہانی سنا رہا ہوں، تو سنئے ذرا توجہ اور انہماک سے۔

رات کے کھانے کے بعد چچا جان نے ہم سب کو اپنے اردگرد بٹھا لیا اور مجسمہ آزادی کی کہانی شروع کی، جو یہ تھی۔

موجودہ دور میں عجائبات عالم پر نظر دوڑائی جائے تو اس چھوٹے سے جزیرے پر نصب شدہ اس انتہائی بلند اور دیوہیکل مجسّمے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو 151 فٹ سے

بھی زیادہ بلند ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا مجسمہ ہے اور یہ STATUE OF LIBERTY کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مجسمہ ایک عورت کا ہے جس نے فضا میں اٹھے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک جلتی ہوئی مشعل تھام رکھی ہے۔ جو پس ماندہ اور غلام قوموں کے لئے روشنی کی علامت ہے۔ یہ عورت روایتی شاہی لباس پہنے' سر پر سات شاخوں والا تاج سجائے نظر آتی ہے' اس کے پاؤں میں غلامی کی ٹوٹی ہوئی زنجیریں ہیں اور بائیں ہاتھ میں ایک کتاب ہے'

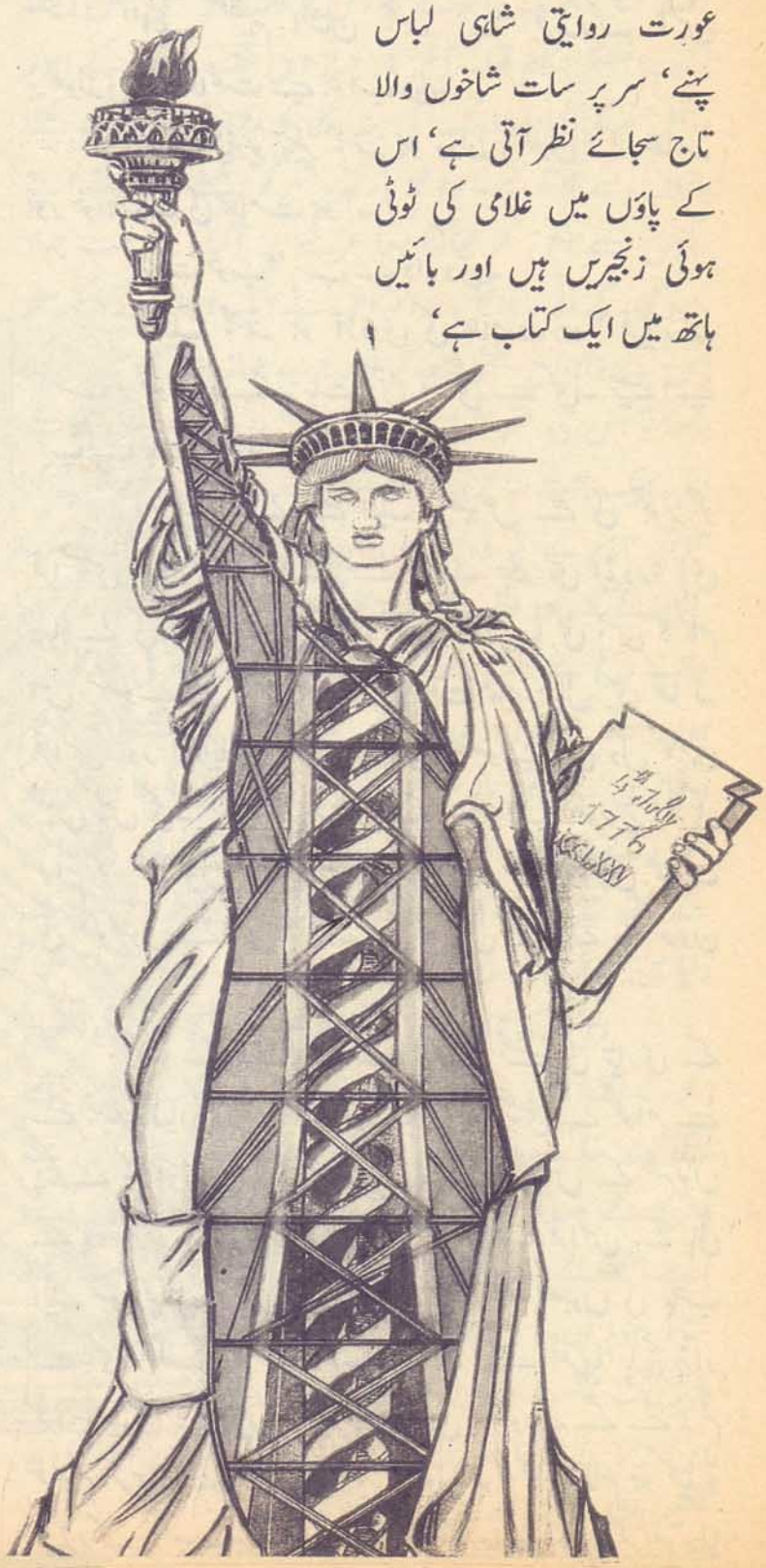

جس پر 4 جولائی 1776ء کے الفاظ کندہ ہیں۔ یہ امریکا کے اعلان آزادی کی تاریخ ہے۔ موسموں کی سختی سے بچاؤ کے لئے اس کو گہرا سبز رنگ کیا گیا ہے۔ یہ مجسمہ تانبے سے بنایا گیا ہے اور 225 ٹن وزنی ہے۔ اس کی اونچائی 151 فٹ سے بھی زیادہ ہے۔ ایک لفٹ سیاحوں کو 89 فٹ یعنی پیڈسٹل تک پہنچاتی ہے۔ پھر وہاں سے دو سیڑھیاں مجسّمے کے خالی حصے یعنی خول سے ہوتے ہوئے تاج تک جاتی ہیں۔ وہاں سے بندرگاہ کا نظارہ بڑا دل کش نظر آتا ہے۔ رات کو اس مجسّمے کو مختلف برقی قمقموں سے روشن کیا جاتا ہے۔ اس وقت اس کی خوب صورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

نیو یارک کی بندرگاہ کے اندر جس جزیرے پر یہ مجسمہ نصب ہے۔ اس کا پہلا نام "بیڈ لوز آئی لینڈ" تھا۔ مگر اس مجسّمے کی تنصیب کے بعد اس جزیرے کو "لبرٹی آئی لینڈ" کا نام دے دیا گیا۔ جس کا مطلب ہے "جزیرۂ آزادی"۔ اب یہ ایک پرہجوم جزیرہ ہے۔ دنیا بھر سے لاکھوں لوگ یہاں آتے ہیں اور آزادی کے جذبات سے سرشار ہو کر جاتے ہیں۔ یہ مجسمہ اب نیو یارک کے سمندر کی شناخت بن گیا ہے۔ آزادی کو خراج تحسین پیش کرنے کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ اس مجسّمے کی ایک اہمیت اور بھی ہے۔ اسے فرانس اور امریکا کے درمیان دوستی کی اولین علامت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ مجسمہ فرانسیسی عوام کی جانب سے امریکی عوام کو بطور تحفہ پیش کیا گیا تھا۔

اس مجسّمے پر آٹھ لاکھ ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ 28 اکتوبر 1886ء کے روز امریکا کے صدر گروور کلیو لینڈ (GROVER CLEVELAND) کی موجودگی میں سو سالہ جشن آزادی کے موقع پر اس مجسّمے کی تنصیب کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔

"اس مجسّمے کی تخلیق کا پس منظر یہ ہے" اس دن چچا جان نے اصل کہانی کی طرف آتے ہوئے کہا تھا۔

"1865ء کے آخر کی بات ہے کہ ایک مشہور

فرانسیسی ادیب، مورخ اور سیاست دان ایڈورڈ ڈی لیباؤلے نے اپنے چند دوستوں کو رات کے کھانے کی دعوت دی۔ سیاسیات اس کا پسندیدہ موضوع تھا اور امریکی سیاسیات میں تو وہ گہری دل چسپی لیا کرتا تھا۔ اس دور میں کسی بھی فرانسیسی کا امریکا میں اس قدر گہری دل چسپی لینا کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ کیوں کہ اس وقت فرانس اور امریکا گہرے دوست تھے۔ کچھ عرصہ پہلے امریکیوں نے برطانوی شہنشاہیت کے خلاف جو کام یاب جنگ لڑی تھی، فرانسیسی عوام نے دل کھول کر اس میں امریکیوں کی مدد کی تھی۔ اس لیے امریکیوں کے دلوں میں فرانسیسی عوام اور حکومت کے لئے تشکر کے گہرے جذبات پائے جاتے تھے۔ فرانسیسی اس نئی آزاد ہونے والی قوم کے بہتر مستقبل کے خواہاں تھے اور ان جذبات کا برملا اظہار کرتے تھے۔ انہیں اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ امریکیوں نے اپنے ملک کی تقسیم کو قبول نہیں کیا اور جنگ آزادی لڑ کر اپنے ملک کے اتحاد کو برقرار رکھا ہے۔

ایڈورڈ ٹی لیباؤلے عام طور پر اپنی تحریروں میں فرانس امریکا دوستی کا پرچار کیا کرتا تھا اور اپنے دوستوں کو بھی اس دوستی کو مزید مضبوط بنانے میں مدد دینے کی تلقین کرتا تھا۔ 1865ء کی ایک رات اس نے جس دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا، اس کا ایک خاص مقصد تھا۔ اس کے ذہن میں فرانس، امریکا دوستی کی پائیداری کے لئے ایک خیال ابھرا تھا۔ یہ خیال ایک ایسے تحفے کا تھا جو فرانسیسی عوام کی جانب سے دوستی کے طور پر امریکی عوام کو پیش کیا جانا تھا۔

"ایک انوکھا خیال ہے"۔ اس کے سبھی دوستوں نے اس کی بات سن کر بیک آواز کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک دوست نے پوچھا۔

"مگر یہ تحفہ کس قسم کا ہو گا؟" ایڈورڈ ٹی لیباؤلے نے جوش سے کہا "کوئی ایسی چیز جو عظیم الشان ہو، جس کی نظیر دنیا میں نہ مل سکے" یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہ سیاہ اور چمک دار آنکھوں والے ایک باریش نوجوان پر پڑی۔ وہ نوجوان فریڈرک آگسٹ برتھولڈی، ایک معروف مصور اور مجسمہ ساز تھا۔ چند لمحوں کے لئے ایڈورڈ ڈی لیباؤلے خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اس نے فریڈرک آگسٹ برتھولڈی سے پوچھا "کہو، تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے"؟

"ایک عظیم الشان مجسمہ ....." فریڈرک آگس برتھولڈی نے ملائمت سے جواب دیا۔

"ایک نیا دیو پیکر مجسمہ جو دونوں ملکوں کے مقاصد اور خواہشات کی علامت ہو"۔

"بہت خوب" سب نے داد دی۔

"ایک مجسمہ جو آزادی کی علامت ہو" فریڈرک آگسٹ برتھولڈی نے یہ بات اتنی آہستگی سے کہی۔ جیسے اپنے آپ سے بات کی ہو۔

امریکیوں کے لئے ایک پرخلوص تحفے کی تجویز کو فرانسیسی عوام کے ہر حلقے نے سراہا۔ جلد ہی ایڈورڈ ڈی لیباؤلے کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل پا گئی جس کا کام اس منصوبے کی تکمیل تھا۔ اس وقت عام خیال یہی تھا کہ فرانس اور امریکا کی حکومتیں اس منصوبے میں دل چسپی نہیں لیں گی۔ کیوں کہ فرانس کے عوام اپنے طور پر امریکی عوام کو تحفہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ مگر بعد میں دونوں ممالک کی حکومتوں نے اس منصوبے کی تکمیل میں بے حد تعاون کیا۔

دنیا کے نئے سب سے بڑے مجسمے کی تیاری کے لئے بہت زیادہ دولت کی ضرورت تھی۔ کمیٹی نے عوام سے چندے کی اپیل کی تو اس کے جواب میں پیرس کے شہریوں نے دو ہزار پاؤنڈ مہیا کرنے کا یقین دلایا۔ فرانس کے باقی ایک سو اکیاسی شہروں اور چھوٹے چھوٹے قصبوں کی جانب سے بھی مختلف رقوم کے وعدے کئے گئے۔ تقریباً پانچ ہزار فرانسیسیوں نے یقین دلایا کہ وہ اس منصوبے کے لئے رقم فراہم کریں گے۔ جب خاصی معقول رقم کا انتظام ہو گیا تو فریڈرک آگسٹ برتھولڈی نے امریکا جانے کا پروگرام بنایا

تاکہ وہاں گھوم پھر کر کسی ایسے مقام کا انتخاب کرے جہاں یہ مجسمہ نصب کیا جائے گا۔

جون 1871ء میں وہ نیو یارک جانے والے بحری جہاز میں سوار ہو گیا۔ سفر کے دوران میں اس نے مجسّمے کے کئی خاکے بنائے مگر ان سے مطمئن نہ ہو سکا۔ یہ جانے بغیر کہ مجسمہ کہاں نصب کیا جائے گا' اس کا خاکے کو حتمی شکل دینا۔ نہایت مشکل کام تھا۔ آخر کار جہاز اس تنگ رودبار کے اندر داخل ہوگیا جو نیویارک کی بندرگاہ کو بحراوقیانوس کے کھلے پانیوں سے ملاتا ہے۔ وہ نیو یارک شہر کو دیکھنے کے لئے اپنے کیبن سے نکل کر بھاگتا ہوا عرشے پر آگیا۔ پھر جب جہاز بندرگاہ کے اندر داخل ہوا تو اس نے ایک ایسا نظارہ دیکھا جو اس کے ذہن پر نقش ہو گیا اور جب جہاز بندرگاہ میں آگے بڑھا تو اس کی نظر "بیڈ لوز آئی لینڈ" پر پڑی جو بندرگاہ کے اندر ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ اس نے بے اختیار زیر لب کہا "اس جزیرے پر وہ عظیم ترین اور دیوہیکل مجسمہ نصب کیاجائے گا۔ وہ ایک عورت کا مجسمہ ہو گا جو کھلے سمندر کی جانب رخ کئے کھڑی ہو گی۔ اس کے پاؤں امریکی ساحل پر ہوں گے مگر اس کی آنکھیں ٹک ٹکی باندھے دور بحر اوقیانوس کے اس پار فرانس کو دیکھ رہی ہوں گی۔ وہ ان دو ملکوں کے درمیان ایک پیارا سا تعلق پیدا کر دے گی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی روشن مشعل ہو گی جو اس تاریک دنیا میں آزادی کی روشنی پھیلائے گی"۔

اس کے ذہن میں مجسّمے کا تصور واضح صورت اختیار کرنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی آبی رنگوں سے اس مجسّمے کے چند خاکے بنائے اور واشنگٹن چلا گیا۔ جہاں اس نے امریکا کے صدر یولیسس گرانٹ سے ملاقات کی اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ صدر یولیسس گرانٹ بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس نے اپنے ایک جرنیل کو خاص طور پر فریڈرک آگسٹ برتھولڈی کے ساتھ نیو یارک بھیجا تاکہ وہ اس جزیرے کا جائزہ لے جہاں فریڈرک آگسٹ برتھولڈی یہ عظیم الشان مجسمہ نصب کرنا چاہتا تھا۔

امریکا کے صدر یولیسس گرانٹ کی دل چسپی کی وجہ سے امریکا کی حکومت کے ساتھ فرانس کی حکومت بھی اس منصوبے میں تعاون کرنے پر تیار ہو گئی۔ برتھولڈی نے محسوس کیا کہ اب اسے اپنا کام شروع کر دینا چاہئے۔ چناں چہ وہ فوری طور پر فرانس واپس چلا گیا۔ اس نے مجوزہ مجسّمے کے لئے نو ابتدائی خاکے بنائے۔ دوستوں کے صلاح مشورے اور اپنے اطمینان کے بعد اس نے مجسّمے کا جو آخری خاکہ پیش کیا وہ ایک ایسی پرعزم عورت کا پیکر تھا جس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا لبادہ لپٹا ہوا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک تختی تھی جس پر اعلان آزادی کی تاریخ نقش تھی۔ اس کے سر پر سورج کی کرنوں جیسی لمبی لمبی نوکیلی سلاخوں کا تاج تھا۔ دایاں بازو ایک بڑی جلتی ہوئی مشعل کو فضا میں بلند کئے ہوئے تھا اور اس کے پاؤں میں غلامی کی ٹوٹی ہوئی زنجیر پڑی تھی۔ اپنے اس خاکے کو دیکھ کر برتھولڈی نے کہا تھا۔ "آزادی کی روشنی دنیا کو منور کر رہی ہے"۔

اس خاکے کو مزید واضح کرنے کے لئے اس نے اسے مٹی کے ماڈل میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ عورت کے چہرے کے نقش اس نے اپنی ماں کے چہرے سے نقل کئے۔ جب مٹی کا ماڈل بن گیا تو اس نے اصل عظیم الشان مجسّمے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جو پیتل سے بنایا جانا تھا۔ فریڈرک آگسٹ برتھولڈی کا اپنا اسٹوڈیو بہت چھوٹا تھا۔ چناں چہ سارا کام پیرس اسٹریٹ جیسی کھلی جگہ منتقل کر دیا گیا۔ جوں جوں کام آگے بڑھتا گیا' عورت کا قد چھتوں سے اوپر ہی اوپر اٹھنے لگا۔

ادھر امریکا کی اس زمانے میں مالی اور معاشی حالت بہت خراب تھی۔ فرانسیسی امریکیوں کو تحفے کے طور پر ایک دیو پیکر مجسمہ دینے والے تھے۔ اس لئے وہ امریکا والوں سے توقع رکھتے تھے کہ وہ مجسّمے کو کھڑا کرنے کے لئے بنیاد مہیا کریں گے۔ اس مقصد کے لئے رقم کی ضرورت تھی جو ان برے حالات میں امریکا کی حکومت مہیا کرنے سے قاصر تھی۔

امریکا کے مشہور اخبار "نیو یارک ورلڈز" کا پبلشر "جوزف پلٹزر" اس وقت آگے بڑھا اور ہر روز اس منصوبے کے بارے میں خبریں اور رپورٹیں شائع کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ چندے کی اپیل بھی کیا کرتا تھا۔ اس نے ایک ایسا کارٹون بھی شائع کیا جس میں "چچاسام" اپنا ہیٹ الٹا کر کے یوں کھڑا تھا کہ لوگ اس کے ہیٹ میں پیسے ڈالیں۔ جوزف پلٹزر کی یہ مہم انتہائی کام یاب ثابت ہوئی اور رقم کی فراہمی تیزی سے شروع ہو گئی۔

ادھر پیرس میں فریڈرک آگسٹ برتھولڈی کا مجسمہ تکمیل کے آخری مراحل طے کر رہا تھا۔ جب اس کی پیمائش کی گئی تو اس کی بلندی 151 فٹ اور ایک انچ نکلی۔ اس لحاظ سے یہ دنیا کا سب سے بلند مجسمہ تھا۔ 21 مئی 1884ء کے روز فریڈرک آگسٹ برتھولڈی نے مجسّمے کو ہر طرح سے مکمل کر دیا۔ پھر 4 جولائی 1884ء کو یہ مجسمہ امریکی وزیر برائے امور فرانس مسٹر مارٹن کو ایک تقریب میں رسمی طور پر تحفے کے طور پر پیش کر دیا گیا۔

اس کے ایک ماہ بعد امریکیوں نے بیڈ لوز آئی لینڈ پر وہ بڑا پتھر پہنچا دیا جس پر فرانسیسی تحفہ نصب کیا جانا تھا۔ اس کے بعد فرانس سے مجسّمے کی امریکا کو منتقلی کا کام شروع ہو گیا۔ مجسّمے کے حصے الگ الگ کر کے بکسوں میں بند کئے گئے۔ اس کے مختلف حصے 214 بکسوں میں سمائے۔ 1886ء کے آخر تک اس دیو پیکر خاتون کے تمام حصے نیو یارک منتقل کئے جا چکے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بیڈ لوز آئی لینڈ کے جزیرے پر مجسّمے کی تنصیب کا کام تیزی سے جاری تھا۔

جس روز مجسّمے کی تنصیب کا کام مکمل ہوگیا۔ اس روز جزیرے پر منعقد ہونے والی تقریب میں نئے امریکی صدر گروور کلیو لینڈ نے خاص طور پر شرکت کی۔ اس روز نیو یارک شہر میں عام تعطیل کی گئی۔ تعلیمی ادارے اور تجارتی مراکز بند رہے۔ جنگی جہاز امریکی پرچم لہراتے ہوئے بندرگاہ میں تیر رہے تھے۔ فوجی بینڈ قومی گیتوں کی دھنیں بجا رہے تھے۔ اور ایک عظیم الشان فوجی پریڈ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جو "مین ہٹن اسٹریٹ" سے مارچ کرتی ہوئی بندرگاہ کی جانب بڑھی۔ لوگ گروہ در گروہ جزیرے کی جانب جا رہے تھے۔ جہاں بادلوں سے ڈھکے ہوئے بھورے آسمان کے نیچے آزادی کا مجسمہ جگ مگا رہا تھا۔ اس روز بندرگاہ میں ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ بعد میں بارش بھی ہونے لگی لیکن لوگوں کا جوش و خروش ختم نہ ہوا۔ صدر گروور کلیو لینڈ نے تقریر کرتے ہوئے کہا "امریکا کے عوام اپنے دوست فرانسیسی عوام کا یہ نادر الوجود تحفہ جو آرٹ کا عظیم شہ پارہ ہے بڑی ہی مسرت، فخر اور تشکر کے ساتھ قبول کرتے ہیں"۔

ہجوم نے پرجوش تالیوں سے اپنے صدر کی تائید کی۔ لاکھوں لوگ بارش میں بھیگ رہے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں دور آسمانوں کو چھوتے ہوئے عظیم الشان مجسّمے کو دیکھ رہی تھیں۔ کئی لوگ فرط جذبات سے رو رہے تھے اور ان کے آنسو بارش کے قطروں میں گھل مل رہے تھے۔ صدر گروور کلیو لینڈ کہ رہے تھے "ہم یہ بات کبھی فراموش نہیں کریں گے کہ آزادی نے ہماری سرزمین پر بسیرا کیا ہے۔ ہم اس کے وقار پر کبھی آنچ نہیں آنے دیں گے"۔

فریڈرک آگسٹ برتھولڈی یہ الفاظ سن کر آبدیدہ ہو گئے۔ انہیں پہلی بار شدت سے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ ان کی تخلیق دنیا بھر کے انسانوں کے لئے کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔

آج کل "مجسمۂ آزادی" کو امریکا کی ایک قومی یادگار کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے اردگرد ایک عجائب گھر قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ دنیا بھر کی قوموں کی آزادی کی علامت ہے۔ آزادی کے مجسّمے نے جو مشعل تھام رکھی ہے اس کی روشنی اس تاریک دنیا میں آزادی کی امید کی چنگاری کی حیثیت رکھتی ہے"۔ یہی وہ سب باتیں تھیں جو چچا جان نے مجھے اس مجسّمے کے بارے میں بتائی تھیں۔ امید ہے آپ کو پسند آئی ہوں گی۔

☆ ☆ ☆

ایک خط اس اطلاع کے ساتھ واپس آگیا کہ مکتوب الیہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ غلطی سے وہ خط دوبارہ پوسٹ ہو گیا۔ اس بار ڈاکیے نے لفافے پر لکھ بھیجا "یہ صاحب ابھی تک زندہ نہیں ہوئے"

(ملک محمد احمد اعوان رحیم یار خان)

استاد (شاگرد سے): نیم حکیم کسے کہتے ہیں؟

شاگرد: جناب! جو حکیم نیم پر بیٹھا ہو۔

استاد: اسے خطرہ جان کیوں کہتے ہیں؟

شاگرد: کیونکہ وہ کسی بھی وقت ہم پر گر سکتا ہے

(محمد ساجد انصاری ڈنگہ)

حامد: یہ تمہارے سر پر پٹی کیوں بندھی ہوئی ہے؟

خالد: وہ سامنے تمہیں سیڑھیاں نظر آرہی ہیں

حامد: ہاں

خالد: یہ مجھے نظر نہیں آئی تھیں

(اویس ممتاز قادری جلال پور پیروالا)

ایک ماں اپنے بچے کو بے تحاشا دعائیں دے رہی تھی تو بچے نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "ماں اتنی دعائیں نہ دو کہ جنت سے بھی آگے نکل جاؤں"

(نوشاد کامرہ کمپلیکس)

ایک صاحب ہر اسٹیشن پر اتر کر ٹکٹ خریدتے تھے۔ سب مسافر حیران ہو رہے تھے۔ ایک مسافر نے تنگ آکر پوچھا۔ "آپ ایک ہی دفعہ اپنی منزل کا ٹکٹ کیوں نہیں لے لیتے"۔

وہ صاحب بولے "بھائی صاحب کیا کروں ڈاکٹر نے لمبے سفر سے منع کیا ہے"

(محمد خرم خلیق راول پنڈی)

1935ء میں دلی میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا' طرح مصرع تھا

"غم نہ کر کہ تیرے رنج کا خوگر ہوں میں"

پچھلی نشستوں پر ایک صاحب بڑے موڈ میں تھے۔ شاعر ابھی شعر مکمل نہ کر پاتا کہ وہ کہتے "ہوں میں"

ایک شاعر کو تاؤ آگیا۔ اس نے غزل پڑھتے ہوئے مصرع اٹھایا "ناریل ہاتھ لگا جس کے وہ بندر" اور اسے نامکمل چھوڑ کر ان صاحب کی طرف دیکھا۔ حسب معمول وہ بڑے جوش سے بولے "ہوں میں"

(زاہد اقبال ذوالفقاری شکردہ)

پہلا دوست: تمہارا بھائی کیا کر رہا ہے آج کل؟

دوسرا دوست: میرے بھائی نے دکان کھولی تھی۔

پہلا: "کیسی چل رہی ہے؟

دوسرا: معلوم نہیں۔

"کیوں؟ بھائی سے ملاقات نہیں ہوتی کیا؟"

"ہوتی ہے۔ وہ چھ ماہ کے لئے جیل میں ہے"۔

دوسرا (حیرانی سے): وہ کیوں؟

پہلا: اس نے ہتھوڑے سے دکان کھولی تھی۔

(فارینہ خان حضرو)

دلچسپ اور ناقابلِ یقین

عبدالستار خان طاہر

بم پھٹنے کے بعد

ہوائی جہاز سے گرایا ہوا بم جب زمین سے ٹکرا کر پھٹتا ہے تو اس کے دھماکے کی قوت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ یہ ہوا کو بڑی تیزی سے پیچھے کو دھکیلتی ہے' اس حد تک کہ جہاں بم پھٹتا ہے وہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس خلا کو ہوا اس قدر تیزی سے آکر پر کرتی ہے جتنی تیزی سے رائفل سے نکلی ہوئی گولی جاتی ہے۔ ایک تو بم کے دھماکے سے مکان اس وقت گرتے ہیں جب دھماکا ہوا کو پیچھے دھکیلتا ہے۔ لیکن یہی ہوا واپس اس قدر تیزی سے آتی ہے کہ اس وقت کھڑے مکان بھی گر پڑتے ہیں۔ زیادہ نقصان یہی واپس آنے والی ہوا کرتی ہے۔

ویٹی کن

یہ عیسائیوں کے سب سے بڑے فرقے رومن کیتھولک کے مذہبی پیش وا "پوپ" کی رہائش گاہ کا نام ہے۔ یہ روم کے قریب اسی نام کے شہر میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین محلات میں ہوتا ہے۔ اس کا رقبہ 1151 X 767 مربع فٹ ہے۔ اس میں 4000 کمرے' 80 عظیم الشان زینے' متعدد ایوانات' ہال کمرے اور باغات ہیں۔ سب سے پہلے 1377ء میں پوپ گری گوری نے اسے اپنی رہائش کے طور پر استعمال کیا تھا۔ 1929ء تک پوپ اپنے آپ کو محصور قیدی تصور کیا کرتے تھے لیکن 1929ء میں حکومت اطالیہ نے ویٹی کن کے ساتھ ایک سیاسی' مذہبی اور مالی معاہدہ کیا جس کی رو سے ویٹی کن کے شہر میں پوپ کو وسیع اختیار حاصل ہو گئے۔ اب اس میں غیر ملکی سفیر بھی رہتے ہیں۔ اس کا اپنا ریلوے اسٹیشن' ڈاک کے ٹکٹ' سکہ' پرچم اور ریڈیو اسٹیشن موجود ہے۔ یہ دنیا کا سب سے چھوٹا ملک اور اقوام متحدہ کا رکن ہے

نقش رستم

ایران پر 626ء سے 652ء تک ساسانی خاندان نے حکومت کی۔ یہ خاندان فن تعمیر کا بڑا دل دادہ تھا۔ نقش رستم اس خاندان کے بادشاہوں کے مقبروں کو کہا جاتا ہے۔ یہ مقبرے پرس پولسن کے مغرب میں بڑی بڑی چٹانوں کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔ یہ سات ہیں۔ لیکن سب سے عمدہ اور قابل دید وہ منظر ہے جو 35 فٹ لمبا اور 16 فٹ اونچا ہے اور جس میں چٹان کو تراش کر شہنشاہ شاہ پور کو ایک گھوڑے پر بیٹھا دکھایا گیا ہے اور قیصر روم قیدی کی حیثیت سے اس کے سامنے کھڑا ہے۔

درخت کے نام خطوط

جرمنی میں 61 سالہ کارل ڈیزنگ واحد ڈاکیا ہے جسے ہر روز ایک درخت پر چڑھ کر ڈاک تقسیم کرنا پڑتی ہے۔ اس کے علاقے میں ایک درخت پڑتا ہے۔ اس درخت کے نام شوہر یا بیوی کے متلاشی لوگوں کے خطوط آتے رہتے ہیں۔ کارل ڈیزنگ یہ خط درخت میں بنے ہوئے 15 فٹ کی بلندی پر ایک سوراخ میں ڈال دیتا ہے۔ ضرورت مند یہاں آتے ہیں اور مطلوبہ خط لے جاتے ہیں۔ 1800ء میں ڈیوک آف اولڈن برگ نے اس درخت کو ڈاک کے پتے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ جب سے اب تک بے شمار مرد و زن اس درخت کی وساطت سے اپنی شادی کرا چکے ہیں۔ اس درخت کے نام دنیا بھر کے مختلف ممالک سے

مراسلات آتے ہیں اور اس کو دیکھنے کے لیے بھی دنیا بھر سے لوگ جاتے ہیں۔

مسلسل 13 سال

ہنگری کا ایک فوجی پال 1915ء میں زخمی ہوا اور 1928ء تک زندہ رہا۔ لیکن اس دوران میں وہ بالکل سو نہ سکا۔ ان تیرہ سالوں میں نیند اس کے قریب تک نہ آئی۔ اس نے دن رات کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ہر حصہ کے بعد وہ کچھ کھا پی لیتا تھا۔ وہ صرف رات کو ایک بجے سے دو بجے تک آرام کرتا تھا اور آنکھیں بند کر کے لیٹا رہتا تھا۔ لیکن اسے نیند نہ آتی تھی۔

سات ہزار سپاہی ایک درخت تلے

دنیا میں جو درخت چاروں طرف سب سے زیادہ پھیلتا ہے وہ بڑ کا درخت ہے۔ قدیم تاریخوں میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ جب اسکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ہندوستان میں بڑ کا ایک ایسا درخت تھا جو اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ اسکندر اعظم کی فوج کے سات ہزار سپاہیوں نے اس کے نیچے پڑاؤ ڈالا تھا۔

65 فٹ لمبا پتہ

جزائر غرب الہند میں پام کا ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کے پتے دنیا کے ہر درخت کے پتوں سے زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔ اس کے ایک پتے کی لمبائی 65 فٹ ہوتی ہے۔

چمکنے والا درخت

انڈونیشیا کے جزیرے جاوا میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جو قد میں 7 فٹ کے لگ بھگ لمبا ہوتا ہے۔ قدرت نے اس میں ایک انوکھی خوبی پیدا کی ہے۔ رات کو وہ اس طرح چمکتا ہے کہ اس کی چمک میلوں دور سے دکھائی دیتی ہے اور آپ اس کی روشنی میں با آسانی لکھ پڑھ سکتے ہیں۔

درخت یا ڈبل روٹی

جزائر غرب الہند میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کی شاخوں کا چھلکا اتار کر لوگ ڈبل روٹی کی طرح کھاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کا ذائقہ بھی ڈبل روٹی کی طرح ہوتا ہے اور تاثیر بھی۔

دودھ کے درخت

آسٹریلیا میں ایک ایسا درخت ملتا ہے جس کا تنا بوتل کی شکل سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے اس بوتل نما تنے میں ہر وقت پانی رہتا ہے۔ اس کے تنے میں سوراخ کیا جائے تو پانی بہنے لگتا ہے۔ لوگ اسے بہت شوق سے پیتے ہیں۔ اسی طرح آسٹریلیا، جنوبی امریکا اور برازیل میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کے رس کا ذائقہ بالکل دودھ جیسا ہوتا ہے۔ لوگ اس کے رس کو دودھ کی طرح استعمال کرتے ہیں۔

سب سے اونچا درخت

اس وقت دنیا کا سب سے اونچا درخت کیلے فورنیا کے جنگلات میں ہے اور اس کا نام "ہارورڈ یسی" ہے۔ اس کی بلندی 367.6 فٹ ہے۔

دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے

محمد عمر سلیم

کھوہ

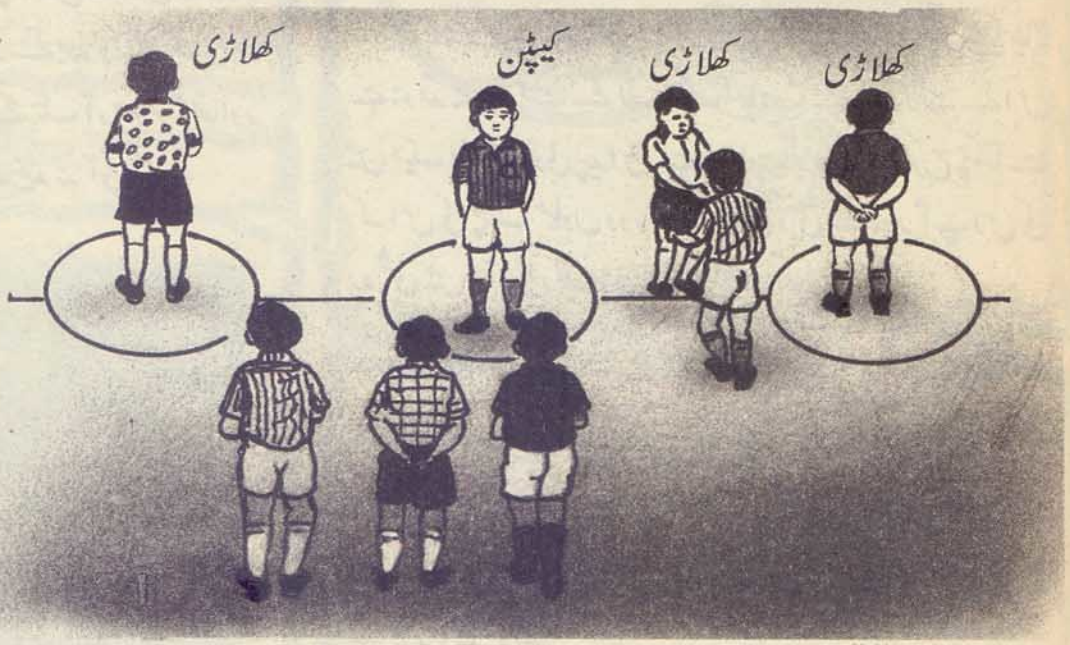

یہ کھیل کم از کم آٹھ بچوں سے کھیلا جا سکتا ہے اور زیادہ اتنے ہوں دو پر تقسیم ہو سکیں۔

اس کے لیے دو ٹیمیں ہوتی ہیں۔ دونوں میں برابر کھلاڑی ہوتے ہیں۔ دونوں ٹیموں کا ایک ایک کپتان ہوتا ہے۔ کھیل کی ابتدا میں ٹاس کیا جاتا ہے۔ جو ٹیم ٹاس میں ہار جاتی ہے۔ اس ٹیم کے کپتان کو چھوڑ کر باقی کھلاڑی تصویر کے مطابق چونے یا چاک کی مدد سے بڑے بڑے دائرے لگاتے ہیں۔ ان دائروں کو لائن سے ملا دیا جاتا ہے۔ لائن کے دونوں اطراف میں دونوں کپتان آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ٹاس جیتی ہوئی ٹیم کے باقی کھلاڑی ان دائروں کے گرد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ٹاس ہاری ہوئی ٹیم کے کھلاڑی دائروں کے اندر۔ دونوں کپتان ہاتھ ملاتے ہیں۔ ٹاس ہاری ہوئی ٹیم کا کپتان دائروں میں کھڑے ہوئے کسی ایسے ساتھی کو کھوہ کہ کر اس کی جگہ خود کھڑا ہو جاتا ہے جو ٹاس جیتی ہوئی ٹیم کے کھلاڑیوں کے قریب کھڑا ہو۔ اب دائرے میں کھڑا ہوا کھلاڑی دوڑ کر ٹاس جیتی ٹیم کے کسی کھلاڑی کو ہاتھ لگا کر آؤٹ کر دیتا ہے۔ دائروں کے درمیان بنی ہوئی لائن کو کراس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اگر لائن کے پیچھے کوئی کھلاڑی کھڑا ہو تو لائن کراس کر کے اسے پکڑنے کے بجائے اپنے قریب ترین ساتھی کو جو دائرے میں کھڑا ہے، کھوہ کہ کر اس کی جگہ خود کھڑا ہو جاتا ہے اور اب دائرے والا باقی کھلاڑیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح ٹاس جیتی ٹیم کے تمام کھلاڑیوں کو آؤٹ کر کے یہ ٹیم جیت جاتی ہے اور اب دوسری ٹیم انہیں باری دیتی ہے۔

کیڑی کاڑا

اس کھیل میں صرف کچھ چاک یا کوئلے چاہیے ہوتے ہیں۔ دونوں ٹیموں میں برابر بچے اور ایک ایک کپتان ہوتا ہے۔ اس کھیل میں ٹاس نہیں کرنا ہوتا۔ ایک ساتھی کھڑا ہو کر اعلان کرتا ہے کہ کھیل کا وقت کتنے منٹوں کا ہے۔

اب دونوں ٹیمیں دو مختلف جگہوں پر جاتی ہیں مثلاً لان کے سامنے کا حصہ اور پیچھے کا حصہ یا کوئی برآمدہ وغیرہ

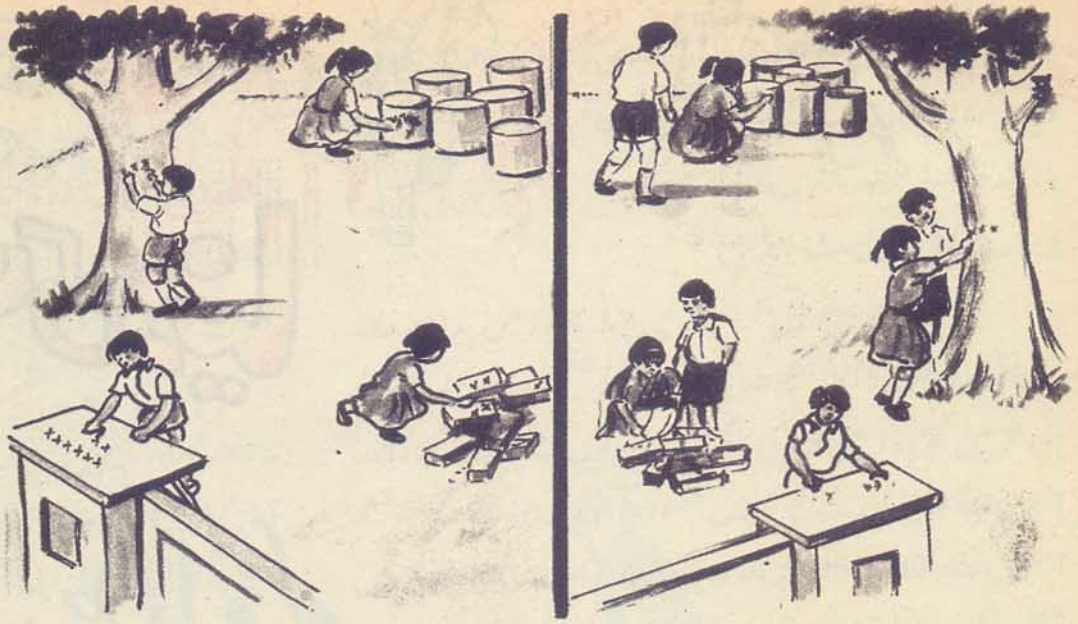

اس پر پڑی ہوئی ایسی چیزوں پر مثلاً پتھروں، درختوں، گملوں، اینٹوں وغیرہ کے نیچے چاک یا کوئلے سے بہت سارے نشان لگا دیتی ہیں۔ وقت ختم ہونے کے بعد دونوں ٹیمیں باری باری ایک دوسرے کو جائزہ کرواتی ہیں۔ اگر ٹیم الف ٹیم ب کی نشان زدہ چیزیں دیکھ لے تو وہ انہیں کاٹ دیتی ہے۔ جو نشان رہ جاتے ہیں انہیں گن لیا جاتا ہے۔ یہی طریقہ دوسری ٹیم کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کے زیادہ نمبر ہوتے ہیں وہ جیت جاتا ہے۔

کوڑا جمال شاہی

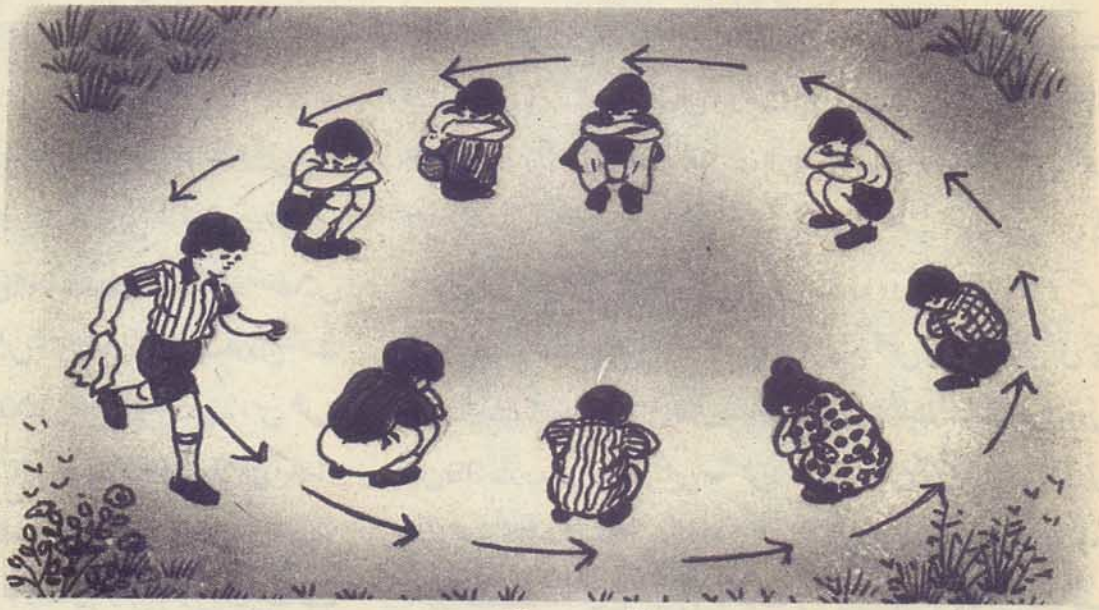

اس کھیل میں پہلے سب بچے پگتے ہیں۔ پگنے میں جو اول آتا ہے سب سے پہلے وہ کوڑا (ایک رومال) لیتا ہے۔ اب باقی بچے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ایک دائرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جس پگنے والے بچے کے ہاتھ میں رومال ہوتا ہے وہ بچوں کے اس دائرے کے گرد مندرجہ ذیل الفاظ گاتے ہوئے بھاگتا ہے۔

"کوڑا جمال شاہی۔ جس نے پیچھے دیکھا اس نے مار کھائی" جب وہ مار کھائی کہتا ہے تو اپنا رومال کسی بھی بچے کے پیچھے چپکے سے پھینک دیتا ہے۔ اگر اس بچے کو پتا چل جائے تو وہ وہی رومال اٹھا کر پھینکنے والے کے پیچھے مارتا ہوا بچوں کے دائرے کے گرد بھاگتا ہے اور مار کھاتا ہوا بچہ پورا چکر لگا کر اس کی جگہ بیٹھ جاتا ہے۔ اگر اس بچے کو پتا نہیں چلتا تو رومال پھینکنے والا دائرہ مکمل بھاگنے کے بعد رومال اٹھا کر بیٹھے ہوئے بچے کو رومال سے مارتا ہے۔ بیٹھا ہوا بچہ بھاگتا ہوا اور رومال پکڑے ہوئے بچے کی مار کھاتا ہوا بچوں کا دائرہ مکمل کرتا ہے اور پھر اپنی جگہ دوبارہ بھاگ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اسی طرح رومال پکڑے ہوئے بچہ گاتا ہوا بھاگتا ہوا کسی اور بچے کے پیچھے رومال ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح جب تک رومال والے بچے کو کوئی دوسرا بچہ نہیں بٹھاتا وہ سب کے پیچھے باری باری رومال ڈالتا رہتا ہے۔

کھیلوں کی دنیا

ماضی کے چند فاسٹ باؤلر

فضل محمود (پاکستان)

18 فروری 1927ء کو لاہور میں پیدا ہوئے پاکستان کے سب سے پہلے فاسٹ بالر تھے۔ 17 سال کی عمر میں فرسٹ کلاس کیریئر کا آغاز کیا۔ 1952ء میں پاکستانی ٹیم نے بھارت کا پہلا سرکاری دورہ کیا تو فضل محمود اس ٹیم کے رکن تھے۔ دہلی ٹسٹ کے بعد لکھنؤ ٹسٹ میں ان کی صلاحیتوں کے جوہر کھلے۔ جہاں انہوں نے دونوں اننگز میں 12 وکٹیں لیں اور پہلے ایسے پاکستانی بالر ہونے کا اعزاز حاصل کیا جس نے کسی میچ میں 16 سے زائد وکٹیں لی ہوں۔ 1954ء میں انگلینڈ کے خلاف اوول میں 99 رنز دے کر 12 وکٹیں حاصل کر کے پاکستان کو فتح دلائی اور اوول کے ہیرو کہلائے۔ فضل محمود دائیں ہاتھ سے میڈیم فاسٹ باؤلنگ کرواتے تھے۔ انہیں گیند کی سوئنگ پر مکمل کنٹرول تھا۔ ان کے لیگ کٹر خاص طور پر مشہور تھے۔ 58-1957ء ویسٹ انڈیز کے خلاف ایک اننگ میں 85.3 اوورز کرائے جو کسی فاسٹ بالر کے لیے نہایت مشکل کام ہے۔ وہ اپنے دور کے بہترین کپتان اور زبردست بالر تھے۔ چار مختلف ممالک کے خلاف 12 یا اس سے زائد وکٹ لینے والے پہلے پاکستانی بالر تھے۔ کپتان کی حیثیت سے پہلا ٹسٹ 59-1958ء میں کراچی میں ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلا جو 10 وکٹوں سے جیتا۔

☆ ٹسٹ کیریئر: 34 ٹسٹ، 150 اننگز، 420 رنز، سب سے زیادہ اسکور

فریڈی ٹرومین (انگلینڈ)

6 فروری 1931ء کو اسکاٹ اسپرنگز اسٹین ٹن یاد کشائر میں پیدا ہوئے۔ 1949ء میں 18 سال کی عمر میں یاد کشائر کی طرف سے فرسٹ کلاس کیریئر کا آغاز کیا اور 1952ء میں بھارت کے خلاف لیڈز ٹسٹ میں اپنے ٹسٹ کیریئر کا آغاز کیا۔ 1964ء میں آسٹریلیا کے خلاف اوول ٹسٹ میں نیل یاک کو آؤٹ کر کے اپنی 300 وکٹیں مکمل کیں۔ اس طرح سب سے پہلے وکٹوں کی ٹرپل سنچری مکمل کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ 11 سال تک ان کا یہ ریکارڈ کوئی نہ توڑ سکا۔ پھر 1976ء میں لانس گبز نے تین سو وکٹیں حاصل کر کے یہ ریکارڈ توڑا۔ تیز ترین بالر کی حیثیت سے ان کا رن اپ اور ایکشن دیکھنے سے ہی خطرناک لگتا تھا اتنی اسپیڈ کے باوجود ان کی لائن ولینتھ ہمیشہ برقرار رہتی تھی۔

☆ ٹسٹ کیریئر: 67 ٹسٹ، 185 اننگز، 14 مرتبہ ناٹ آؤٹ، 981 رنز، اوسط 13.81، بہترین اسکور 39 ناٹ آؤٹ، 64 کیچز، 15178 گیندیں، 522 میڈن اوورز 6625 رنز دیے، 21.57 کی اوسط سے 307 وکٹیں اننگ میں، 5 یا زائد وکٹ 17 مرتبہ میچ میں، 10 یا زائد وکٹ 3 مرتبہ، بہترین باؤلنگ 8/13

60' ایک ہاف سنچری' 6 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 11 کیچز' 34' 34 رنز دے کر 139 وکٹ' اوسط 24.70' اننگ میں 5 یا زائد وکٹ 13 مرتبہ' میچ میں 10 یا زائد وکٹ 4 مرتبہ' بہترین بالنگ 7/42

ویزلے ہال (ویسٹ انڈیز)

12 ستمبر 1937ء میں کرائسٹ چرچ بارباڈوز میں پیدا ہوئے۔ اپنے کرکٹ کیریئر کا آغاز بحیثیت ایک وکٹ کیپر بیٹسمین سے کیا۔ 11 سال کی عمر میں گھڑدوڑ میں ان کی ٹانگوں کے دونوں ٹخنے ٹوٹ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے پورے کیریئر میں خصوصی طور پر بنوائے گئے جوتے استعمال کئے۔ 59-1958 میں دورہ پاکستان اور بھارت میں اپنی ٹیم میں شامل تھے۔ وہ اتنی تیز بالنگ کرواتے کہ اسے کھیلنا تقریباً ناممکن ہی ہوتا۔ انہوں نے بے جان وکٹوں پر انتہائی جاندار بالنگ کی اور بارہا اپنی ٹیم کو فتح سے ہم کنار کیا۔ ویزلے ہال کو ٹسٹ کرکٹ میں ہیٹ ٹرک کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ وہ فاسٹ بالنگ کے لازوال ہیرو تھے۔

☆ ٹسٹ کیریئر: 48 ٹسٹ' 166 اننگز' 14 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 818 رنز سب سے زیادہ اسکور 50 ناٹ آوٹ' اوسط 15.73' 2 نصف سنچریاں 11 کیچز' 10421 گیندیں' 312 میڈن اوورز' 5066 رنز کے عوض 192 وکٹیں' اوسط 26.38' 9 مرتبہ اننگ میں 5 یا زائد وکٹیں' ایک مرتبہ میچ میں 10 وکٹ' بہترین بالنگ 7/69

ڈینس للی (آسٹریلیا)

18 جولائی 1949ء کو پرتھ کے علاقے بسیسا کو میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے 1971ء میں انگلینڈ کے خلاف ایڈیلیڈ کے مقام پر اپنا پہلا ٹسٹ کھیلا۔ اس میں للی نے 84 رنز دے کر 5 وکٹ حاصل کیں۔ 1981ء میں میلبورن کے گراؤنڈ پر لیری گومز کو آؤٹ کر کے 310 وکٹ حاصل کیں۔ ون ڈے میں سب سے پہلے 100 وکٹ لینے والے بالر بھی ڈینس للی ہی تھے۔

☆ ٹسٹ کریئر: 70 ٹسٹ' 190 اننگز 24 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 905 رنز سب سے زیادہ اسکور 73 ناٹ آؤٹ' اوسط 13.71' ایک نصف سنچری' 23 کیچز' 18467 گیندیں' 651 میڈن اوورز 8493 رنز کے عوض 335 وکٹ' اوسط 2323.96 مرتبہ اننگ میں 5 یا زائد وکٹ سات مرتبہ میچ میں 10 یا زائد وکٹ' بہترین بالنگ 7/83

☆ ون ڈے کیریئر: 63 میچ' 34 اننگز' 8 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 240 رنز بہترین اسکور 42 ناٹ آؤٹ' اوسط 10 9.22 کیچز' 3593 گیندیں' 2145 رنز دے کر 103 وکٹ' اوسط 20.82 بہترین 5/34' 4 یا زائد وکٹ 6 مرتبہ

عمران خان (پاکستان)

پاکستان کے یہ عظیم فاسٹ بالر اور کامیاب کپتان 25 نومبر 1952ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ 1969ء میں اپنے فرسٹ کلاس کیریئر کا آغاز کیا اور 1971ء میں عمران نے دورہ انگلینڈ کے اوبجسٹن ٹسٹ میں اپنے ٹسٹ کیریئر کا آغاز کیا۔ پھر 77-1976 کے سیزن میں عمران خان کو اٹیک بالر کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ اس ہوم سیریز میں عمران خان نے 8 وکٹ لیں۔ اسی سال آسٹریلیا کے خلاف سڈنی ٹسٹ میں دونوں اننگز میں 6' 6 وکٹیں حاصل کر کے پاکستان کی جیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پاکستان یہ ٹسٹ دس وکٹ سے جیت گیا اور یہ آسٹریلیا کی زمین پر پاکستان کی پہلی فتح تھی۔ آپ 83-1982ء میں بھارت کے خلاف ایک سیریز میں پاکستان کی طرف سے 6 ٹسٹ میں 40 وکٹیں اور 300 رنز بنانے والے واحد کھلاڑی ہیں۔ 82-1981ء میں ایک میچ میں پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ 14 وکٹیں لینے کا اعزاز بھی انہی کو حاصل ہے۔ بحیثیت کپتان آپ نے 12 مرتبہ اننگ میں 5 یا زائد وکٹیں حاصل کیں جو ٹسٹ کرکٹ میں کسی بھی کپتان کی بالنگ کا عالمی ریکارڈ ہے۔ 4 مرتبہ دس وکٹ لینے کا بحیثیت کپتان عالمی ریکارڈ ہے جو انہوں نے حاصل کیا۔ 1992ء کے ورلڈ کپ میں فتح ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

ٹسٹ کیریر: 88 ٹسٹ' 126 اننگز' 25 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 3807 رنز 6 سنچریاں' 18 نصف سنچریاں' بہترین اسکور 136' 28 کیچز' 19458 گیندیں' 724 میڈن اوورز' 8258 رنز دے کر 362 وکٹیں' اوسط 22.31' 23 مرتبہ اننگ میں 5 یا زائد وکٹ 6 مرتبہ میچ میں 10 یا زائد وکٹ' بہترین بالنگ 8/58

☆ ون ڈے کیریئر: 175 میچ' 151 اننگز' 40 مرتبہ ناٹ آؤٹ 3709 رنز اوسط 33.41 ایک سنچری۔ 19 نصف سنچریاں' بہترین اسکور 102 ناٹ آؤٹ' 37 کیچز' 7461 گیندیں' 123 میڈن اوورز' 4845 رنز کے

عوض 182 وکٹیں، اوسط 26.61، بہترین بالنگ 6/14، 4 مرتبہ 4 یا زائد وکٹ۔

جیف تھامسن (آسٹریلیا)

جیوفری رابرٹ تھامسن 16 اگست 1950ء کو سڈنی کے نواحی علاقے گرین ایکرز میں پیدا ہوئے۔ 73-1972 کے سیزن میں اپنے فرسٹ کلاس کیریئر کا آغاز کیا۔ 1972ء میں نے ملبورن میں پاکستان کے خلاف اپنا پہلا ٹسٹ کھیلا۔ 75-1974 میں انگلینڈ کے خلاف تھامسن نے برسبین ٹسٹ میں 9 وکٹیں لے کر مخالف ٹیم کو عبرت ناک شکست دی۔ 1975ء میں جیف تھامسن کی رفتار برطانوی میدانوں میں 99.68 میل (60 کلومیٹر) فی گھنٹا ریکارڈ کی گئی۔ ہیلمٹ کے استعمال کا ذمہ دار تھامسن ہے۔ کھلاڑیوں نے اس کی طوفانی گیندوں سے بچنے کے لیے ہیلمٹ استعمال کرنا شروع کیا جو اس عظیم بالر کے لیے ایک اعزاز ہے۔

☆ ٹسٹ کیریئر: 51 ٹسٹ، 73 اننگز، 20 مرتبہ ناٹ آؤٹ، 669 رنز، اوسط 12.62، بہترین اسکور 49، 10541 گیندیں، 298 میڈن اوورز، 5601 رنز دے کر 200 وکٹیں، اوسط 28.00 اننگ میں 5 یا زائد وکٹ 8 مرتبہ 20 کیچز، بہترین بالنگ 6/46

☆ ون ڈے کیریئر: 50 میچ، 130 اننگز، 6 مرتبہ ناٹ آؤٹ، 181 رنز، اوسط 7.54 بہترین اسکور 21، 19 کیچز، 2696 گیندیں 37 میڈن اوورز، 1942 رنز کے عوض 55 وکٹیں، اوسط 35.36، بہترین باؤلنگ 4/67

رچرڈ ہیڈلی (نیوزی لینڈ)

یہ عظیم ریکارڈ ساز کھلاڑی 3 جولائی 1951 کو کرائسٹ چرچ میں پیدا ہوا۔ 72-1971 میں 20 سالہ رچرڈ ہیڈلی نے اپنے فرسٹ کلاس کیریئر کا آغاز کیا۔ اور فرسٹ کلاس کے تیسرے ہی میچ میں ہیٹ ٹرک کر کے 73-1972 میں پاکستان کے خلاف ویلنگٹن ٹسٹ میں اپنے ٹسٹ کیریئر کا آغاز کیا۔ 86-1985ء میں آسٹریلیا کے خلاف برسبین ٹسٹ میں دونوں اننگز میں 52-9، 71-6 کی کارکردگی دکھائی۔ جو آج بھی نیوزی لینڈ کی طرف سے ریکارڈ ہے۔ 90-1989ء میں ہیڈلی نے اپنے 80 ویں ٹسٹ میں کرائسٹ چرچ میں بھارت کے خلاف سنجے منجریکر کو آؤٹ کر کے اپنی 400 وکٹیں مکمل کر کے دنیا کا پہلا بالر ہونے کا اعزاز حاصل کیا جس نے 400 کا ہدف عبور کیا۔

☆ ٹسٹ کیریئر: 86 ٹسٹ، 134 اننگز، 19 مرتبہ ناٹ آؤٹ، 3124 رنز، اوسط 27.16، 2 سنچریاں، 15 نصف سنچریاں، بہترین اسکور 151، 39 کیچز، 21918 گیندیں، 819 میڈن اوورز، 9611 رنز دے کر 431 وکٹ، اننگ میں 5 یا زائد وکٹ 36 مرتبہ میچ میں 10 یا زائد وکٹ 9 مرتبہ بہترین بالنگ 9/52

☆ ون ڈے کیریئر: 115 میچ، 198 اننگز، 17 مرتبہ ناٹ آؤٹ، 1749 رنز، اوسط 21.59، 4 ہاف سنچریاں، بہترین سکور 79، 27 کیچز، 158 وکٹیں، اوسط 21.56، اننگ میں 4 یا زائد وکٹ 6 مرتبہ، بہترین بالنگ 5/25

میلکم مارشل (ویسٹ انڈیز)

18 اپریل 1958ء کو سینٹ مائیکل بارباڈوز میں پیدا ہوئے۔ 78-1977ء اپنے فرسٹ کلاس کیریئر کا آغاز کیا اور پھر 1978.79 میں بھارت کے خلاف بنگلور ٹسٹ میں اپنے ٹسٹ کیریئر کا آغاز کیا۔ 1984ء میں انگلینڈ کے خلاف لیڈز ٹسٹ میں مارشل نے ان فٹ اور ہاتھ پر پلاسٹر بندھا ہونے کے باوجود زبردست بالنگ کرواتے ہوئے صرف 53 رنز کے عوض انگلینڈ کی 7 وکٹیں حاصل کیں۔ 1988ء میں پھر صرف 92 رنز دے کر انگلینڈ کی 10 وکٹیں لیں اور پھر مانچسٹر ٹسٹ میں دوسری اننگ میں صرف 94 گیندوں پر 22 رنز کے عوض 7 کھلاڑی آؤٹ کیے۔ اس سیریز میں مارشل نے 35 وکٹیں لیں جو ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ پہلے ویسٹ انڈیز فاسٹ بالر ہیں جنہوں نے 300 وکٹیں لیں۔ مارشل نے اپنی تیز بالنگ سے کرکٹ کی دنیا میں جو تباہی مچائی وہ فاسٹ بالنگ کی مثال بنی۔ دل کش ایکشن اور بے پناہ اسپیڈ کے باوجود گیند پر کنٹرول یہ سب عظیم میلکم مارشل کی خصوصیات تھیں۔

☆ ٹسٹ کیریئر: 81 ٹسٹ، 107 اننگز، 11 مرتبہ ناٹ آؤٹ، 1810 رنز اوسط 18.85، 10 نصف سنچریاں، 92 بہترین اسکور، 25 کیچز، 376 وکٹ، اوسط 20.94، اننگ میں 5 یا زائد وکٹ 22 مرتبہ، میچ میں 10 یا زائد وکٹ 4 مرتبہ بہترین بالنگ 7/22

☆ ون ڈے کیریئر: 136 میچ، 183 اننگز، 19 مرتبہ ناٹ آؤٹ، 955 رنز اوسط 14.92، 2 نصف سنچریاں، بہترین اسکور 66، 15 کیچز، 157 وکٹیں، اوسط 26.96، اننگ میں 4 وکٹ 6 مرتبہ، بہترین بالنگ 4/18

شرارتی لکیریں

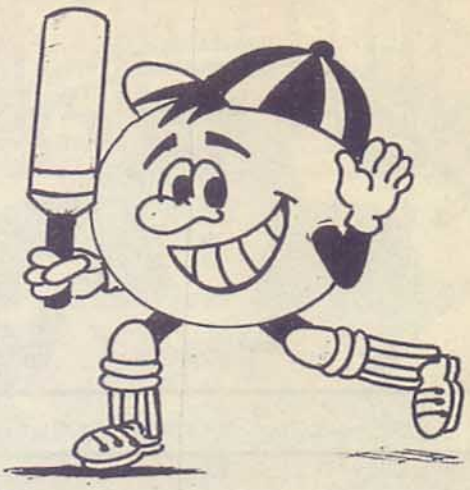

شاہد
ریاض
شاہد

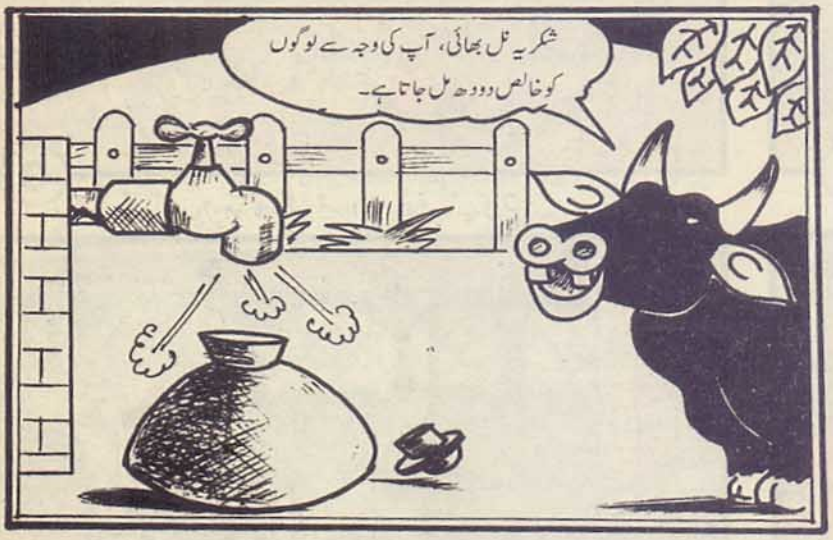

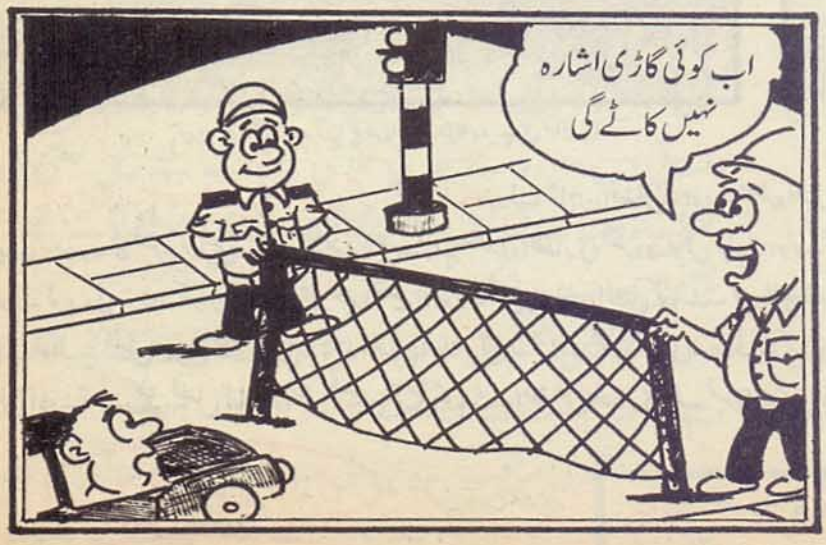

ہونہار مصور

مرغی خانہ

کرن اسلم بہاول پور (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

ابراہیم مجدی کوئٹہ (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

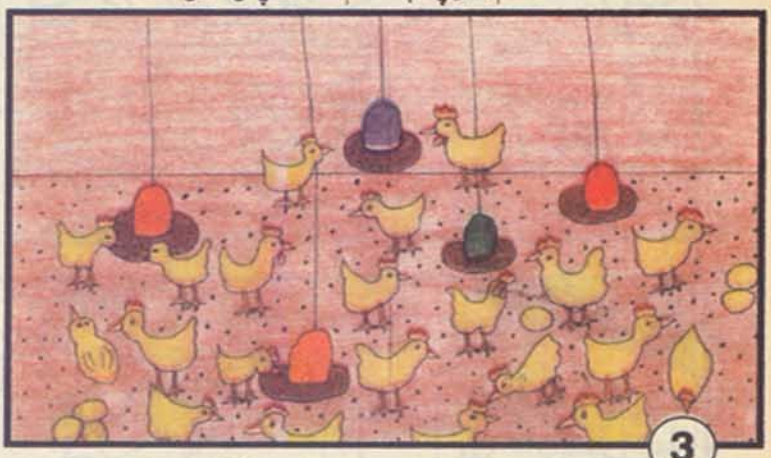

سدرہ مسعود کامونکی (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

محمد سرفراز اقبال لاہور چھاؤنی (چوتھا انعام 45 روپے کی کتابیں)

حمیرا انجم جھنگ صدر (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

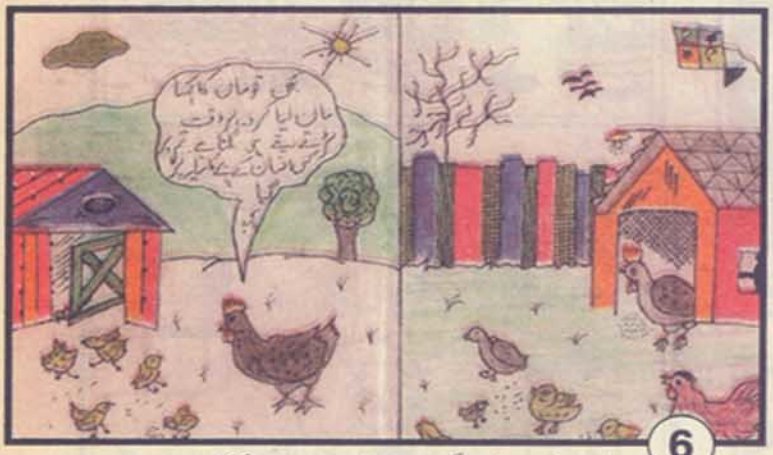

محمد ذی شان رحمان سرگودھا (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: صدف شاہین افضال لاہور۔ مبشرہ اقبال سرگودھا۔ نوید اسلم لاہور چھاؤنی۔ سیدہ راحیلہ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ اصفانور کراچی۔ حسیب لاہور۔ ثنا حسن کراچی۔ آمنہ سلیم کراچی۔ زاہد مظہر ذوالفقاری شکردہ۔ کومل مجاہد لاہور۔ رانا نبیل مجاہد لاہور۔ سمیعہ نور نیازی کراچی۔ مجاہد شینواری کوہاٹ۔ دانیال منصور لاہور۔ نوید ولی تربت مکران۔ حافظ محمد عبدالنصیر لاہور۔ گل باز خان افغانی کوہاٹ۔ محمد طاہر خان کوہاٹ۔ محمد نسیم طاہر ہنگو۔ فرح ناز کراچی۔ خان شہزادہ کوٹو۔ محمد قاسم اعظم بھٹی گوجرانوالہ۔ شکیل میرانی گڈو بیراج۔ نائرہ سلمان اسلام آباد۔ فرزانہ محمود کراچی۔ صالحہ ناز کراچی۔ محسن نعیم بھٹی خان پور۔ عائشہ سحر گوندل چونیاں۔ حسیب احمد لاہور۔ اسماء رفیق فیصل آباد۔ آمنہ رفیق فیصل آباد۔ دانش حسین قریشی کوہاٹ۔ اصغر علی انصاری چک نمبر 59 ای بی عارف والا۔ محمد نعیم شہزاد لاہور۔ ماجد رشید لاہور چھاؤنی۔ عظیم سرور لاہور۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

دسمبر کا موضوع: موسم سرما کی صبح — آخری تاریخ 7 نومبر

جنوری کا موضوع: چاند رات — آخری تاریخ 7 دسمبر

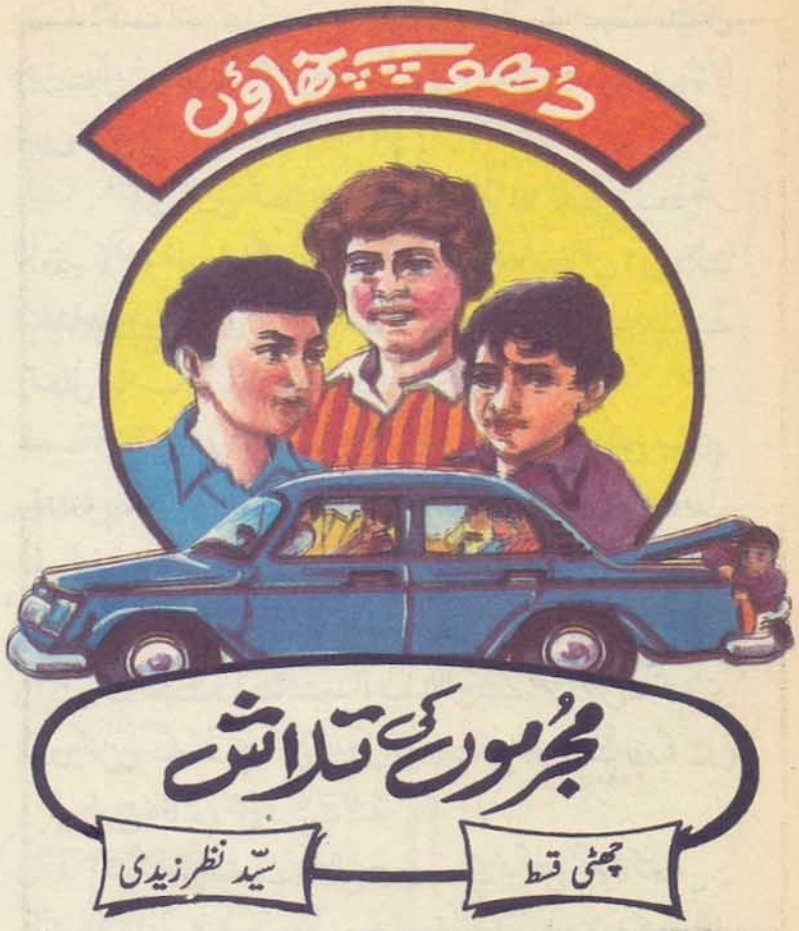

بیٹے کے یوں ایکا ایکی گم ہو جانے کی وجہ سے قسطانی صاحب اور ان کی بیگم کی حالت بہت خراب تھی۔ اپنی پوری زندگی میں آج پہلی بار ان لوگوں کو یہ تجربہ ہوا تھا کہ ان پر بھی کوئی مصیبت آسکتی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ کچھ یوں خیال کرتے تھے کہ انہیں صرف حکم چلانے اور عیش کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ مصیبتیں اٹھانے کے لیے صرف غریب غربا ہیں۔

چھوٹے قسطانی کے گم ہو جانے کی خبر سن کر ان کے تقریباً تمام دوست اور عزیز ان کی کوٹھی میں جمع ہو گئے تھے اور لان میں کرسیوں پر بیٹھے قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا یہ آوارہ مزاج لڑکا خود ہی فرار ہو گیا ہے۔ کچھ یہ رائے دے رہے تھے کہ برخوردار صرف تفریح کے طور پر ادھر ادھر ہو گیا ہے۔ گھر والوں کو پریشان کر کے خود ہی آجائے گا۔ بعض کے نزدیک یہ ان خطرناک مجرموں کی کارستانی تھی جو بچوں کو اغوا کر کے ان کے والدین سے بھاری رقمیں وصول کرتے ہیں۔

خود قسطانی صاحب اس سلسلے میں یہ خیال کرتے تھے کہ یہ کارستانی کچی بستی کے مزدوروں، خاص طور پر چودھری ماجھے کی ہے اور یہ بات بعض اور لوگوں کو بھی یوں ٹھیک معلوم ہوتی تھی کہ چھوٹا قسطانی چودھری ماجھے کے گھر کی تلاشی لینے کے لیے کچی بستی کی طرف گیا تھا۔ یہ بات توصیف نے بتائی تھی۔

قسطانی صاحب کے عزیزوں اور دوستوں کے علاوہ پولیس کے ایک بڑے افسر جعفری صاحب بھی تفتیش کے سلسلے میں آئے تھے اور صدیقی صاحب کے پاس بیٹھے ان سے باتیں کر رہے تھے۔ گفت گو کا موضوع چھوٹے قسطانی کا اچانک غائب ہو جانا ہی تھا۔

صدیقی صاحب نے کہا "جعفری صاحب! شاید آپ اتفاق نہ فرمائیں لیکن میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اس کی ساری ذمہ داری قسطانی صاحب پر ہی ہے۔ اول تو ان حضرت کی بہت بڑی کوتاہی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ شاید آپ نے اس برخوردار کو دیکھا ہو۔ پیسوں سے بڑھ کر پیپی اور ٹیڈیوں سے بڑھ کر ٹیڈی نظر آتا ہے۔ اسے اس کے سوا کوئی کام ہی نہیں کہ سارا دن آوارہ گردی کرتا پھرے۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے غرور اور لالچ کی وجہ سے ساری دنیا کو اپنا مخالف بنا لیا ہے۔ فیکٹری کے مزدور تو بغاوت پر آمادہ تھے ہی اس پر غضب یہ کیا ہے کہ کچی بستی کے مزدوروں کی جھونپڑیاں اٹھوانے کا ارادہ کر کے انہیں بھی اپنا دشمن بنا لیا"۔

"اور اسی وجہ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ کام ان مزدوروں کا ہی ہے۔ توصیف بیٹے کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ چھوٹا قسطانی اس مزدور کے گھر کی تلاشی لینے کے لیے کچی بستی کی طرف روانہ ہوا تھا جس کے بچے آپ کے ہاں پڑھنے آتے تھے" جعفری صاحب نے کہا۔

"لیکن جعفری صاحب، اس مزدور کا بھی تو ایک بچہ غائب ہے!" صدیقی صاحب نے کہا۔

جعفری صاحب بے پروائی کے انداز میں بولے "ارے صاحب، آپ مجرموں کی چالاکیوں سے آگاہ نہیں ہیں۔ یہ بات

عین ممکن ہے کہ ان لوگوں نے خود کو بے گناہ ظاہر کرنے کے لیے اپنے بچے کو بھی غائب کر دیا ہو!"

"آپ کا تجربہ یقیناً بہت زیادہ ہے لیکن میں ایک بار پھر عرض کروں گا کہ ان غریبوں کو محض شک کی وجہ سے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔ بچارے پہلے ہی مصیبتوں کی چکی میں پس رہے ہیں!" صدیقی صاحب نے کہا۔

صدیقی صاحب کی اس بات کے جواب میں جعفری صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے کہ کوٹھی کے احاطے کی دیوار کے پاس پتھر پر لپٹا ہوا ایک کاغذ گرا۔ اتفاق سے جعفری صاحب اس طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھے اور کاغذ اٹھا کر پھر اپنی کرسی پر آبیٹھے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ اس کاغذ سے کوئی خاص بھید ظاہر ہو گا لیکن وہ اسے سب مہمانوں کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک ایک کر کے سب مہمان رخصت ہو گئے تو انہوں نے وہ کاغذ پڑھا اور ان کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ انھوں نے قسطانی صاحب کی طرف دیکھ کر کہا "مبارک ہو جناب، کم از کم آدھی پریشانی تو ختم ہو گئی ہماری!"

یہ بات سن کر قسطانی صاحب جلدی سے ان کے پاس پہنچ گئے اور اس خط کا مضمون جاننے کی کوشش کی۔ جعفری صاحب نے اونچی آواز میں خط پڑھنا شروع کیا۔

"پیارے ابا جان، السلام علیکم، اس وقت میں سخت مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں۔ میری جان صرف اس صورت میں بچ سکتی ہے کہ آپ اس مہینے کی 24 تاریخ کو رات کے 12 بجے راول پنڈی میں سعید پوری روڈ کے آٹھویں سنگ میل کے پاس 5 لاکھ روپے رکھ دیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر مقررہ وقت تک روپیہ نہ رکھا گیا یا آپ نے اس خط کا ذکر پولیس سے کر دیا تو پھر قیامت تک میری صورت نہ دیکھ سکیں گے۔ یہ لوگ مجھے فوراً قتل کر ڈالیں گے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب تک ان لوگوں کا سلوک میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔ میں ہر طرح تندرست ہوں۔ فقط، آپ کا بدنصیب بیٹا۔

قسطانی صاحب نے جلدی سے اٹھ کر جعفری صاحب کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اسے اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولے "اے اللہ تیرا شکر ہے، تیرا شکر ہے تو نے میرے بچے کی خیریت کی خبر سنائی۔ جعفری صاحب! میں آج ہی روپے وہاں پہنچا دوں گا!"

"آج نہیں قسطانی صاحب! آج تو 18 تاریخ ہے۔ اگر روپیہ پہنچانا ضروری بھی ہوا تو مقررہ تاریخ اور خاص اس وقت پہنچانا چاہیے جو ان مجرموں نے لکھا ہے" جعفری صاحب نے قسطانی صاحب سے خط لیتے ہوئے کہا۔

"تو کیا آپ کے خیال میں روپیہ ادا کئے بغیر بھی میرا بچہ آزادی حاصل کر سکتا ہے؟" قسطانی صاحب نے جعفری صاحب کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولے "ان مجرموں کو روپیہ دینا تو انہیں اور طاقت ور بنانا ہے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ ہم ایسی تدبیر کریں گے کہ بچہ بھی ان کی قید سے رہا ہو جائے اور انہیں کسی طرح کا فائدہ بھی نہ پہنچے"۔

"جعفری صاحب! کہیں میرے بچے کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچ جائے۔ وہ خیریت سے اپنے گھر آجائے۔ میں تو پانچ لاکھ کی جگہ پچاس لاکھ خرچ کرنے کو بھی تیار ہوں" بیگم قسطانی قریب آکر بولیں۔

آپ بالکل بے فکر رہیے بیگم صاحبہ! ان شاء اللہ آپ کے بچے کو بالکل نقصان نہ پہنچے گا۔ ہم ان مجرموں کے لیے ایسا جال تیار کریں گے کہ وہ آپ سے آپ اس میں پھنس جائیں گے اور آپ کا روپیہ بھی محفوظ رہے گا" جعفری صاحب نے یقین دلاتے ہوئے کہا اور پھر قسطانی صاحب سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے تاکید کی کہ آپ اس خط کا ذکر کسی سے بھی نہ کریں!

قسطانی صاحب اور ان کی بیگم ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اگرچہ اب انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ ان کا بچہ صحیح سلامت ہے لیکن پھر بھی دل کا بوجھ کم نہ ہوا تھا۔ بار بار یہ خیال پریشان کرتا تھا کہ اگر خدانخواستہ مجرموں کی نیت خراب ہو گئی اور انہوں نے بچے کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا تو کیا ہو گا!

وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا چاہتے تھے۔

ایک دوسرے کو تسلیاں دینا چاہتے تھے لیکن خاموش تھے۔ جیسے انہیں بات شروع کرنے کی ہمت نہ ہو رہی ہو۔ دونوں اسی حالت میں بیٹھے تھے کہ بیرا آیا اور ملاقاتی کارڈ قسطانی صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ یہ جعفری صاحب کا کارڈ تھا۔ نام پڑھ کر قسطانی صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے اور بیرے کی طرف دیکھ کر کہا "صاحب کو عزت کے ساتھ اندر لے آؤ اور اس کے بعد چائے کا انتظام کرو۔ ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لانا؟"

بیرا چلا گیا اور چند لمحے بعد ہی جعفری صاحب کو ساتھ لے آیا۔ سلام اور مصافحے کے بعد جعفری صاحب قسطانی صاحب کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئے اور کوٹ کی اندر والی جیب سے پڑھنے والی عینک نکالتے ہوئے بولے "قسطانی صاحب! میں اس بات کے لیے معافی چاہتا ہوں کہ اس وقت آکر آپ کو بے آرام کیا لیکن آپ سے ملنا بے حد ضروری تھا۔ آپ کے بچے کے بارے میں چند ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا"۔

"فرمائیے' فرمائیے۔ آپ بالکل خیال نہ کیجئے' مجھے ذرا بھی زحمت نہیں ہوئی" قسطانی صاحب نے جوش بھری آواز میں کہا۔ ان کے چہرے پر اک دم رونق آگئی تھی۔

جعفری صاحب نے وہی خط میز پر پھیلاتے ہوئے کہا "اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے قسطانی صاحب کہ اب آپ اس سلسلے میں کسی شخص سے بھی کوئی بات نہ کیجئے۔ یوں سمجھ لیجئے جیسے آپ کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ راول پنڈی جانے کے لیے تیاری شروع کر دیجئے۔ ہمیں وہاں ایک دو دن پہلے ہی پہنچ جانا چاہیے"۔

"تو کیا آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے؟" قسطانی صاحب نے خوش ہو کر سوال کیا۔

جعفری صاحب نے کہا "جی' دراصل یہ بات بہت ضروری ہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔ اس قسم کے مجرموں سے نمٹنے کے لیے بہت زیادہ ہوشیاری کی ضرورت ہے"۔

"لیکن جعفری صاحب! کہیں ایسا نہ ہو کہ مجرم اس بات سے چڑ جائیں اور میرے بچے کو کسی قسم کا نقصان پہنچ جائے!" قسطانی صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ بالکل بے فکر رہیے۔ مجرموں کو میرے وہاں ہونے کا بالکل پتا نہ چلے گا بلکہ اگر میں خود نہ بتاؤں تو آپ بھی مجھے نہ پہچان سکیں گے" جعفری صاحب نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ یہ بات سن کر قسطانی صاحب خوش ہو گئے۔ اطمینان بھرے لہجے میں بولے "پھر ٹھیک ہے میں تو صرف یہ اطمینان چاہتا تھا کہ بچے کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے گا"۔

"اور دیکھئے ایک اور بات یہ ہے کہ مجرموں کو

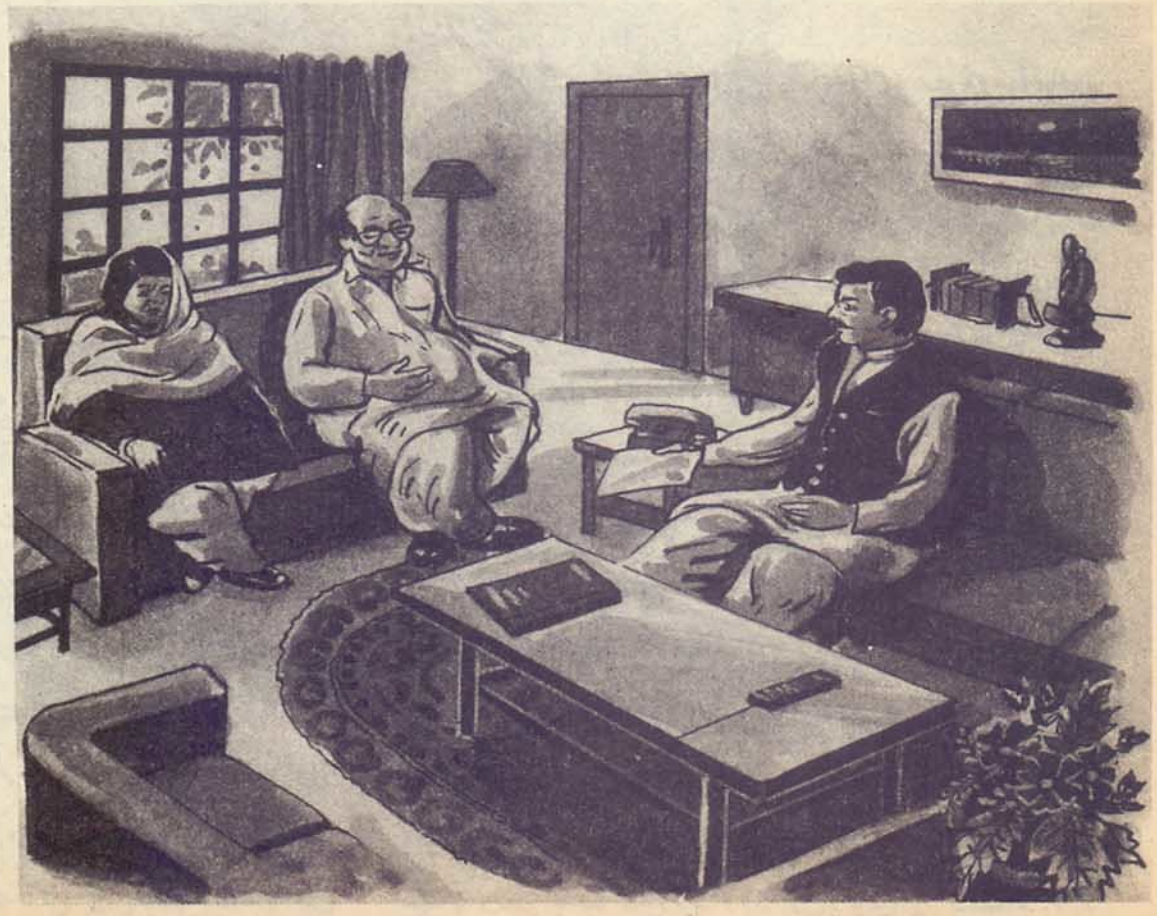

دینے کے لیے آپ جو نوٹ فراہم کریں ان کے نمبر سلسلہ وار ہونے چاہیں۔ یہ بات اس طرح ممکن ہو سکتی ہے کہ آپ چیک کاٹ کر بینک سے نئے نوٹ حاصل کریں۔ اگر یہ بات مشکل معلوم ہو تو میں مدد کے لیے حاضر ہوں" جعفری صاحب بولے۔

"جی یہ کونسی مشکل بات ہے لیکن ازراہ کرم کیا آپ یہ بتانے کی زحمت اٹھائیں گے کہ ایسا کرنے کا کیا فائدہ ہو گا؟" قسطانی صاحب نے سوال کیا۔

جعفری صاحب نے جواب دیا "کوئی حرج تو نہیں لیکن فی الحال یہ بات نہ بتانا ہی مناسب ہے۔ مہربانی کر کے آپ میری ہدایات پر پورا پورا عمل کیجئے اور ہاں دیکھئے راول پنڈی میں آپ انٹر کانٹینٹل میں ٹھہرئے اور اس عرب کا انتظار کیجئے جو کالی عبا پہنے ہوئے ہو گا۔ امید ہے اس سے ملنے کے بعد آپ کی تمام مشکلیں ختم ہو جائیں گی"۔

بیرا کافی دیر پہلے چائے رکھ گیا تھا۔ یہ بات ختم ہوئی تو انہیں چائے کا خیال آیا اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس بات کو یہیں ختم کر کے اب ہم چھوٹے قسطانی اور کلو کی طرف چلتے ہیں اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ وہ کس حال میں ہیں!

چھوٹے قسطانی کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک بند کمرے میں چارپائی پر لیٹا ہے اور اس کے ہاتھ اور پاؤں مضبوطی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کہاں ہے اور اسے کس نے اس طرح جکڑ دیا ہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اسے ساری باتیں یاد آگئیں اور وہ سمجھ گیا کہ اس وقت وہ غنڈوں کی قید میں ہے۔

اپنی طرف سے اگرچہ بہت بہادر اور عقلمند بنا ہوا تھا۔ سب پر دھونس جماتا رہتا تھا اور ہر شخص سے اکڑ کر بات کرتا تھا لیکن حقیقت میں بے حد بزدل اور ڈرپوک تھا۔ اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھا تو خوف کی وجہ سے اس کی جان ہی نکل گئی اور وہ ننھے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ اتنی اونچی آواز میں رو رہا تھا کہ اس کی آواز دور دور تک جا رہی تھی۔ غنڈے ساتھ والے بڑے کمرے میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ انہوں نے رونے کی آواز سنی تو پھکڑ منہ بنا کر بولا "یار، پہلے اس گیدڑ کو چپ کراؤ، یہ تو بہت ہی ڈرپوک معلوم ہوتا ہے!"

"یہ کام تو واقعی بہت ضروری ہے اور میرا خیال ہے یار تم ہی اسے بہتر طور پر کر سکتے ہو، اٹھو جلدی سے!" رمضانی نے کہا۔

یہ بات سن کر پھکڑ نے اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھا اور تاش کے پتے میز پر رکھتے ہوئے بولا "بچو، میں خوب سمجھتا ہوں کہ تو نے کس لیے میری ڈیوٹی لگائی ہے۔ لیکن خبردار جو پتوں میں ادل بدل کی۔ یہ بازی تو میں تجھے ہرا کر ہی چھوڑوں گا۔ ابھی آ کر کھیل شروع کرتا ہوں!" یہ کہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کمرے میں آگیا جس میں چھوٹے قسطانی کو بند کیا گیا تھا۔ چھوٹا قسطانی پہلے ہی اس بکرے کی طرح چلا رہا تھا جسے قصائی ذبح کرنے کے لیے لے جا رہا ہو۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اور بھی تڑپ اٹھا۔ جیسے سچ مچ کسی نے اس کے گلے پر چھری چلا دی ہو۔

"کیوں چلا رہا ہے!" پھکڑ نے بجلی کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ کمرا ایک دم روشنی سے بھر گیا اور چھوٹا قسطانی ڈانٹ سن کر یوں خاموش ہو گیا جیسے کسی نے اس کے حلق میں اک دم بریکیں لگا دی ہوں۔

پھکڑ غصے بھرے انداز میں چلتا ہوا اس کے پاس آگیا اور جیب سے پستول نکال کر اس کی نال سیدھی کر کے بولا "اگر اب تیرے حلق سے ہلکی سی آواز بھی نکلی تو گولی مار دوں گا۔ کان کھول کر سن لے! یہ تیری نانی اماں کا گھر نہیں ہے جو تیری آواز سن کر دوڑی چلی آئیں گی۔ یہ ہمارا گھر ہے اور ہم تجھ جیسے کمینوں کو ٹھیک کرنے کے سارے گر جانتے ہیں۔ ہاں اب بتا کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی تجھ پر؟"

"جی، جی جی مہربانی کر کے مجھے یہ بتا دیجئے کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور میرے ہاتھ پیر کیوں باندھے گئے ہیں؟" چھوٹے قسطانی نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"تیرے ہاتھ پیر ہم نے باندھے ہیں اور تو ہماری قید میں ہے۔ اگر اپنا بھلا چاہتا ہے تو چپ چاپ لیٹا رہ۔ ہم نے تیرے باپ کے نام خط بھیج دیا ہے۔ وہ پانچ لاکھ روپے ادا کر دے گا تو تجھے چھوڑ دیا جائے گا۔ ورنہ تو دوسری دنیا کی سیر کرے گا" پھکڑ

نے پستول جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک ہی وہ غضب ناک آواز میں چلایا "او تیرا بیڑا غرق! یہ تو تو نے سارا پلنگ خراب کر دیا۔ اگر پیشاب پاخانہ آیا تھا تو کہا کیوں نہیں؟"

"کس سے کہتا جناب! یہ کمرا تو باہر سے بند تھا" چھوٹے قسطانی نے کہا۔ پانچ لاکھ روپوں کے بدلے آزادی ملنے کی بات سن کر اس کا خوف کم ہو گیا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کے پاپا روپیہ فوراً ادا کر دیں گے اور وہ اپنے گھر پہنچ جائے گا۔

پھکڑ اس موڈ میں تھا کہ اپنے اس قیدی کی خوب ٹھکائی کرے لیکن اتفاق سے یہ دلیل اس کی سمجھ میں آگئی کہ جب یہاں کوئی تھا ہی نہیں تو وہ کس سے کہتا۔ منہ اور ناک پر ہاتھ رکھ کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور یہ کہتے ہوئے باہر کا رخ کیا "اسی طرح چپ چاپ لیٹا رہ بدبخت! میں آدمی بھیج کر چارپائی اور تیرے کپڑے صاف کراتا ہوں"۔

چھوٹے قسطانی کو پیشاب اور پاخانے میں لتھڑا دیکھ کر پھکڑ کو بہت گھن آئی تھی۔ وہ بار بار تھوکتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو اسے کلو نظر آیا جو نلکے کے پاس بیٹھا ہوا جھوٹے برتن مانجھ رہا تھا۔ اس نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور چھوٹے قسطانی کے پاس لے جا کر اس کی حالت دکھانے کے بعد اشاروں سے یہ بات سمجھائی کہ بالٹی میں پانی لا کر اس کے کپڑے، چارپائی اور فرش صاف کر دے۔ یہ باتیں سمجھا کر پھکڑ لوٹ گیا اور اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر تاش کھیلنے لگا۔

اپنے آپ کو اس طرح بندھا ہوا اور کلو کو آزاد دیکھ کر چھوٹا قسطانی بہت حیران ہوا۔ اسے اس بات پر شرم بھی آئی کہ جسے وہ جانوروں سے زیادہ ذلیل خیال کرتا تھا آج اس کے سامنے خود ذلیل ہو کر پڑا تھا۔

کلو بہت ذہین لڑکا تھا۔ اس نے چھوٹے قسطانی کے چہرے سے اس کے خیالات کا اندازہ کر کے بالکل آہستہ آواز میں کہا "میاں صاحب، اب تو آپ کو یقین آگیا کہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے۔ روپیہ پیسہ کوئی ایسی چیز نہیں جو ہمیشہ ہی انسان کو مصیبتوں سے محفوظ رکھ سکے"۔

"کیا تو نے ہمیں ان لوگوں کے ہاتھوں گرفتار کرایا ہے؟"

چھوٹے قسطانی کے دماغ میں یہ نیا خیال آیا اور وہ غصے بھری نظروں سے کلو کو گھورنے لگا۔

"نہیں میاں آپ بالکل غلط سمجھے ہیں۔ میں نے آپ کو گرفتار نہیں کرایا بلکہ میں تو خود ان ظالموں کے پنجے میں پھنس گیا ہوں۔ اور ہاں دیکھئے ان لوگوں کے سامنے مجھ سے ہرگز کوئی بات نہ کیجئے۔ میں یہاں گونگا اور بہرہ بنا ہوا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ اور میں دونوں ان کی قید سے آزادی حاصل کر لیں۔ لیجئے اب باتیں ختم!" یہ کہہ کر کلو اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ بالٹی میں پانی لا کر پہلے اس نے چھوٹے قسطانی کی پتلون اور ٹانگیں دھوئیں اور پھر جلدی جلدی چارپائی اور کمرے کا سارا فرش صاف کر دیا۔

چھوٹا قسطانی اب عقیدت اور محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اس بات پر شرمندہ ہو رہا تھا کہ اس نے ایسی حالت میں بھی اس اچھے لڑکے کے بارے میں کس قدر غلط بات سوچی اور پہلے صرف اس وجہ سے اسے ذلیل سمجھتا رہا کہ وہ غریب تھا۔

کلو نے سارا کام ختم کر کے باہر سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور پھر برتن مانجھنے لگا۔ اس نے اپنے چہرے کو کچھ ایسا بنا لیا تھا کہ واقعی گونگا معلوم ہوتا تھا۔ یہ لڑکا اگرچہ ایک بہت ہی غریب گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے غریب ماں باپ اس کی تعلیم اور تربیت کی طرف بالکل توجہ نہ دے سکے تھے لیکن اللہ پاک نے اپنی خاص مہربانی سے اسے بہت ہی اچھا ذہن دیا تھا۔ معمولی سا اشارہ پا کر وہ پوری بات سمجھ لیتا تھا اور پھر اپنی خداداد قابلیت سے ایسی ترکیب نکالتا تھا کہ دوسرے حیران رہ جاتے تھے۔ توحید کی مہربانی سے اسے گنتی کے چند دن تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تھا لیکن اس معمولی سی مدت ہی میں جوڑ ملا کر جملے بنانے لگا تھا اور جمع تفریق کے معمولی سوال حل کرنے سیکھ گیا تھا۔

یہ مجرم جن کے پنجے میں چھوٹا قسطانی اور وہ پھنس گئے تھے، بہت چالاک تھے اور اس طرف سے بہت ہی چوکنے رہتے تھے کہ کوئی ان کے بھید سے واقف نہ ہو جائے۔ اگر انہیں ذرا بھی شک ہو جاتا کہ اس لڑکے نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ یہ گونگا

اور بہرہ نہیں بلکہ اچھا بھلا ہے تو وہ اسے زندہ نہ چھوڑتے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو ایسی کام یابی سے گونگا اور بہرہ ثابت کیا تھا کہ انہیں اس کے بارے میں ذرا سا شک بھی نہ ہوا تھا۔ بلکہ وہ اس بات سے ایک طرح خوش تھے کہ خدمت کے لیے ایسا بے زبان لڑکا مل گیا ہے جو دنیا کی کوئی بات جانتا ہی نہیں۔

کلو نے اب یہ بات جان لی تھی کہ مجرموں کا یہ مکان لاہور کے محلے شادباغ میں ہے اور اس بڑی سڑک سے زیادہ دور نہیں جس پر کثرت سے کاریں، تانگے اور بسیں دوڑتی رہتی ہیں۔ مکان کی پچھلی کھڑکی سے سڑک کا منظر صاف نظر آتا تھا اور بالکل سامنے ہی ایک دکان کے سائن بورڈ پر موٹے حرفوں میں محلے کا نام بھی لکھا تھا۔

برتن مانجھتے ہوئے کلو اب برابر اس بات پر غور کر رہا تھا کہ چھوٹے قسطانی اور اپنے گھر والوں کو یہ اطلاع کس طرح پہنچائے کہ ہم دونوں اس وقت غنڈوں کے پنجے میں پھنسے ہوئے ہیں اور فلاں جگہ ہیں۔ آخر سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ اپنی اس کام یابی پر وہ اک دم مسکرا پڑا اور پھر پورے جوش و خروش سے یوں برتن مانجھنے لگا جیسے کہ رہا ہو "لو بھئی پتیلو اور پلیٹو! اپنی کام یابی کی خوشی میں تمہیں بھی شیشے کی طرح چمکائے دیتا ہوں"۔

کلو سارا دن خوب محنت اور شوق سے ان آدمیوں کی خدمت کرتا رہا۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ سب دوسرا شو دیکھنے کے لیے سنیما چلے گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے کلو کو بھی چھوٹے قسطانی کی طرح ایک کمرے میں بند کر دیا تھا اور مکان کے سارے کمروں کو اچھی طرح بند کر کے باہر والے بڑے دروازے پر مضبوط تالا لگا کر گئے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کلو پر بھی بھروسا نہ کرتے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو بہت بے پروا نظر آ رہے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب کے سب نشے میں تھے۔

پھکڑ نے داخل ہوتے ہی نعرہ لگایا "کیوں دوستو! کیا خیال ہے۔ چائے کا ایک ایک گرما گرم کپ نہ ہو جائے!"

"تیرے منہ میں گھی شکر کیا حلوائی کی پوری دکان! اس وقت تو قسم خدا کی میرے دل کی بات کہی ہے تو نے" رمضانی نے کہا۔

"لیکن یار سوال یہ ہے کہ اس وقت چائے آئے گی کہاں سے؟ اپنی گلی کی اکلوتی دکان تو شام سے ہی بند ہو جاتی ہے"۔ پھکڑ نے سوچتے ہوئے کہا اور اس کی یہ بات سن کر رمضانی چہکا "ابے آنی کہاں سے ہے، وہ اپنا گونگا تیار کر دے گا۔ جگاؤ اسے۔ چلو پیارے جلدی کرو!"

"ہاں یار! یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ بھئی رمضانی تیری عقل کا بھی جواب نہیں" پھکڑ نے تعریف بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر کلو کو جگانے کے لیے چل دیا۔

کلو بے چارے کو چائے بنانی تو کیا آتی تھی لیکن ان ظالموں کا حکم پورا کرنا ضروری تھا۔ اس نے ہیٹر جلا کر جیسی کچھ بنی چائے تیار کر دی اور یہ گرم پانی پی کر ہی وہ اپنے بستروں میں گھس گئے۔ پھکڑ کو اتنا ہوش تو ضرور رہا کہ اس نے بڑے دروازے کو اندر سے بند کر کے تالا لگا دیا ہے لیکن کلو کو دوبارہ بند کرنے کا خیال کسی کو نہ آیا۔ نشے کی حالت میں وہ سب اس کی بنائی ہوئی چائے کی تعریفیں کر رہے تھے۔

کلو چائے کے برتن سمیٹ کر اس کمرے میں آ گیا جس میں اسے بند کیا گیا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سب گہری نیند سو گئے ہیں تو چپکے سے باہر نکلا اور کنڈی کھول کر چھوٹے قسطانی کے کمرے میں آ گیا۔

تکلیف اور خوف کی وجہ سے چھوٹا قسطانی بھی ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس نے آہٹ سنی تو گھگھیاتے ہوئے بولا "کون! کون ہے!"

کلو جلدی سے اس کے پاس آ گیا اور تسلی دیتے ہوئے بولا "سرکار! گھبرائیے نہیں میں کلو ہوں اور ان ظالموں کے پنجے سے آزادی حاصل کرنے کی ایک بہت اچھی ترکیب بتانے آیا ہوں"۔

"اچھا، اچھا تم ہو۔ اگر تمہیں کوئی ایسی ترکیب معلوم ہو گئی ہے تو خدا کے لیے جلدی بتاؤ!" چھوٹے قسطانی نے کہا۔

"ہاں مجھے ایک شان دار ترکیب سوجھی ہے۔ میں ان

ظالموں کے سامان میں سے کاغذ اور قلم لے آیا ہوں۔ آپ اپنے ابو کے نام ایک خط لکھ دیجئے"۔ یہ کہ کر کلو کمرے سے باہر نکل گیا اور غنڈوں کے کمرے میں جا کر اس بات کا اطمینان کرنے کے بعد لوٹ آیا کہ وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔ اب اس نے دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد بجلی روشن کر دی اور پھر جلدی جلدی اس رسی کی گرہیں کھول ڈالیں جس سے چھوٹے قسطانی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ یہ کام کرنے کے لیے ہاتھوں کے ساتھ اسے اپنے دانتوں سے بھی کام لینا پڑا۔ کیوں کہ ان ظالموں نے بڑی سخت گرہیں لگائی تھیں۔

"کلو بھیا! مہربانی کر کے جلدی سے میرے پیر بھی کھول دو۔ پھر ہم دونوں یہاں سے بھاگ چلیں گے" چھوٹے قسطانی نے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے دباتے ہوئے کہا۔ لیکن کلو نے اس کی یہ بات نہ مانی۔ سمجھانے کے انداز میں کہا "نہیں یہاں سے اس طرح بھاگ نکلنا ممکن نہیں"۔

چھوٹے قسطانی کے ہاتھوں کی رسی کھل گئی تو کلو نے کہا "لیجئے خط لکھئے اور انہیں بتائیے کہ میں محلّہ شاد باغ کے ایک مکان میں قید ہوں۔ پولیس بھیج کر جلدی سے جلدی آزاد کرا لیجئے۔ پھر میں وہ خط کسی طرح باہر بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ اور ہاں دیکھئے خط میں اس مکان کا پورا پتا ضرور لکھئے!" یہ کہ کر کلو نے مکان کا نمبر، گلی کا نمبر اور محلے کا نام بتایا۔

چھوٹے قسطانی کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ اس کے پیر کھول دیئے جائیں اور وہ فوراً یہاں سے بھاگ نکلے لیکن اس وقت کلو کی بات ہی ٹھیک لگی۔ اس نے جلدی جلدی مختصر سا ایک خط لکھا اور کلو کا بتایا ہوا اس مکان کا پتا درج کر کے تہ کرنے کے بعد اپنے گھر کا پتا لکھ دیا۔ پھر کلو کو دیتے ہوئے بولا "اگر یہ خط کسی طرح لیٹر بکس میں ڈال دیا جائے تو ہمارے گھر پہنچ جائے گا"۔

کلو نے خط جیب میں رکھ لیا اور چھوٹے قسطانی کے ہاتھ اسی طرح باندھ کر اور بجلی بجھا کر باہر آگیا۔

اس کام میں اچھا خاصا وقت لگ گیا تھا لیکن خوش قسمتی سے غنڈوں میں سے کسی کی آنکھ نہ کھلی تھی۔ وہ سب نشے میں بے ہوش پڑے تھے۔ کلو نے اطمینان سے چھوٹے قسطانی والے کمرے کی باہر والی کنڈی لگائی اور پھر اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔

بچپن کی عمر میں یوں بھی نیند زیادہ آتی ہے۔ اس کے علاوہ اب کلو کو ہر طرح اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ وہ ایسا بے فکر ہو کر سویا جیسے پرانے زمانے کے سوداگر گھوڑے بیچ کر سویا کرتے تھے۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب پھکڑ نے ٹھوکر مار کر اسے اٹھایا۔

ٹھوکر لگی تو کلو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور معاملے کی نزاکت محسوس کر کے جلدی سے ہاتھ جوڑ دیئے اور اشاروں میں یہ بات سمجھانے لگا کہ مجھے گہری نیند آگئی تھی۔ پھکڑ نے زور سے اس کے سر پر ایک چانٹا رسید کیا اور غصے بھری آواز میں بولا "نواب کے بچے! ابھی تو نے ہماری اصلی صورت نہیں دیکھی، اس لیے یوں پیر پسارے سو رہا ہے۔ چل اٹھ کر چائے تیار کر!" زبان سے کہنے کے

علاوہ یہ بات پھکڑ نے اسے اشاروں سے بھی سمجھائی اور وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف بھاگا۔

کوئی بارہ بجے کے قریب یہ لوگ چائے پی کر فارغ ہوئے تو تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ پھکڑ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور اندر کی طرف لگا ہوا قفل کھول کر باہر جھانکا۔ خاکروب اپنی ٹوکری اور جھاڑو لیے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر پھکڑ غصے بھری آواز میں چلایا "ابے یہ وقت ہے تیرے آنے کا! پتا ہے کچھ! بارہ بج رہے ہیں!" یہ کہہ کر اس کے سر پر ایک دھول جمائی۔

"بابو جی میں تو تین بار چکر لگا چکا ہوں بہتیرا دروازہ کھٹ کھٹایا لیکن کسی نے سنا ہی نہیں" خاکروب نے عاجزی سے جواب دیا۔ پھکڑ اپنے آپ کو بابو کہلوا کر بہت خوش ہوتا تھا۔ خاکروب کی زبان سے یہ لفظ سنا تو خوش ہو گیا اور دروازے سے ہٹتے ہوئے بولا "چل جلدی جلدی صفائی کر! وہ گونگا باورچی خانے میں ہو گا۔ اس سے کہہ پانی ڈال دے گا۔ یاد رکھ ساری نالیاں اچھی طرح صاف نہ ہوئیں تو کھال ادھیڑ دوں گا تیری"۔

خاکروب کو راستہ ملا تو جواب دیئے بغیر جلدی سے اندر آگیا اور باورچی خانے کے سامنے رک کر اشارے سے کلو کو سمجھایا کہ بالٹی میں پانی بھر کر نالیاں اور بیت الخلا دھلوا! خاکروب کا اشارہ پاتے ہی کلو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پانی کی بالٹی اٹھا کر اس کے پاس آگیا۔

پھکڑ دروازہ بند کر کے پھر تاش کی بازی میں شریک ہو گیا تھا۔ صحن میں جو کافی لمبا چوڑا تھا اب کلو اور خاکروب ہی تھے۔ ناحق پٹنے کی وجہ سے خاکروب بہت ناراض تھا اور کام کرتے ہوئے خاصی اونچی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ "خدا جانے کن چور اچکوں سے واسطہ پڑا ہے۔ آدمی کو آدمی ہی نہیں سمجھتے۔ جب دیکھو مارنے پیٹنے پر تیار، لعنت ہو ایسے کام پر، پتا نہیں خدا نے چوہڑے کی ذات کو کیوں پیدا کیا ہے۔ اس سے اچھا تھا کہ وہ گائے بھینس بنا دیتا!"

کلو نے یہ باتیں سنیں تو سمجھ گیا کہ اس بیچارے کی ناحق پٹائی ہوئی ہے اور یہ پھکڑ سے سخت ناراض ہے۔ وہ رات سے ہی اس فکر میں تھا کہ جو خط چھوٹے قسطانی سے لکھوایا ہے کسی طرح باہر بھیجے۔ خاکروب کی باتیں سن کر بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اسے راز دار بنا لیا جائے! اگرچہ یہ کام خطرے سے خالی نہ تھا لیکن خط بھیجنے کی ایک یہی ترکیب تھی، چنانچہ ہمت سے کام لے کر کلو نے یہ فیصلہ کر ہی لیا اور بات شروع کرنے کے لیے یہ بہانہ کیا کہ بالٹی سے پانی ڈالتے ڈالتے سو روپے کا نوٹ اس طرح خاکروب کے پیروں میں ڈال دیا گویا جیب سے گر پڑا ہے۔ یہ نوٹ بھی اس نے ان برے لوگوں کے بٹوے سے نکالا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہوا چھوٹے قسطانی کو ساتھ لے کر ان کی قید سے نکلے گا۔ اگرچہ یہ چوری تھی لیکن چوروں کی چوری اسے جائز لگی تھی۔ نوٹ پر نظر پڑی تو خاکروب نے چونک کر کلو کی طرف دیکھا۔ کلو نے مسکراتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا "دیکھتے کیا ہو اٹھا لو، میں نے تمہارے لیے ہی ڈالا ہے"۔

"ارے تم تو اچھے بھلے زبان والے ہو بابو جی!" خاکروب نے نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کا غصہ ایک دم خوشی میں تبدیل ہو گیا اور وہ عقیدت بھری نظروں سے کلو کی طرف دیکھنے لگا۔

کلو نے کہا "بھائی میں تو ان ظالموں کے خوف سے گونگا اور بہرہ بنا ہوا ہوں۔ اگر تم نے میری مدد کی تو اور بہت سارے روپے دوں گا۔ کام صرف یہ ہے کہ یہ خط اس کوٹھی پر پہنچا دو جس کا پتا لکھا ہوا ہے۔ اور بھائی دیکھو یہ راز ظاہر نہ ہونے پائے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آزادی مل گئی تو پورے دو ہزار روپے دلواؤں گا تمہیں۔ دو ہزار کی بات سن کر تو غریب خاکروب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے نوٹ اور خط لے کر جلدی سے جیب میں رکھ لیا اور سر کو ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے بولا "گردن بھی کٹ جائے تو یہ بھید ظاہر نہ کروں گا بابو جی، آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے!"

"اچھا اب جلدی جلدی اپنا کام ختم کرو اور باہر بھاگو۔ کل آؤ گے تو اور باتیں ہوں گی۔ ہاں دیکھو اس خط کا پتا اپنے گھر جا کر کسی اعتبار کے آدمی سے پڑھوانا!" کلو نے کہا اور خاکروب جلدی جلدی جھاڑو چلانے لگا۔ جیسے اس کے بازوؤں میں بجلی بھر گئی ہو۔ (باقی آئندہ)

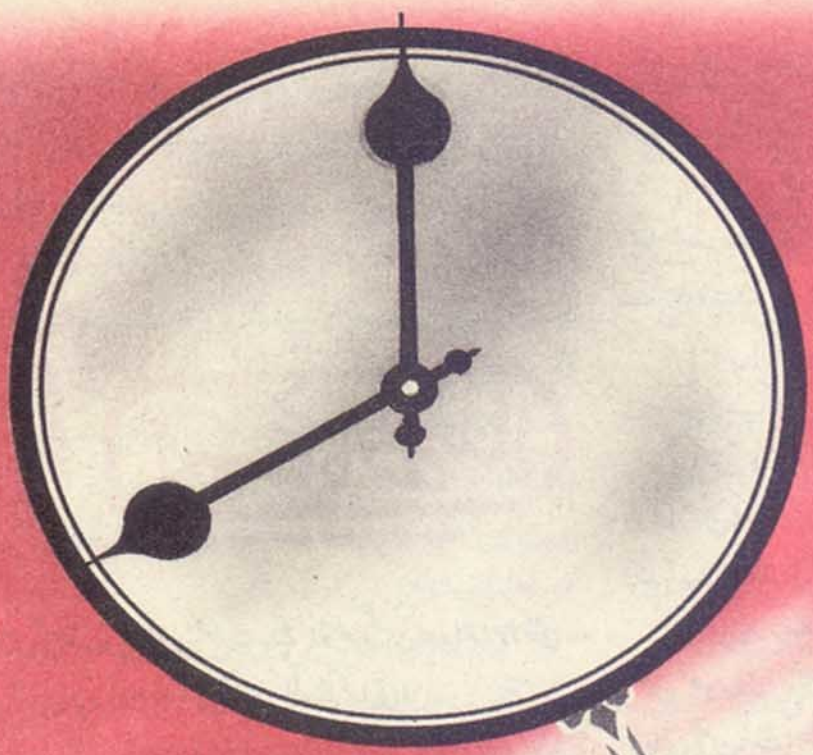

وقت

ضیاء الحسن ضیا

کہ رہا ہے بہتا دریا وقت کا
قیمتی ہے لمحہ لمحہ وقت کا
اہل ہمت اپنی منزل پائیں گے
جو ہیں کاہل پیچھے وہ رہ جائیں گے
وقت کے جو ساتھ میں چلتے رہے
کامیاب و کامراں وہ ہو گئے
وقت کا پنچھی کہیں رکتا نہیں
وقت کا پرچم کبھی جھکتا نہیں
وقت کا جو ساتھ دے سکتے نہیں
وقت سے وہ کام لے سکتے نہیں
مانتا ہے جو بھی کہنا وقت کا
وقت بن جاتا ہے اس کا رہنما
وقت دیتا ہے سبق ہم کو یہی
دوستو غفلت میں مت رہنا کبھی

کہانیوں میں دھوپ چھاؤں، شکریہ بچے، انوکھا محسن اور الزام اچھی تھیں۔ شرارتی لکیریں پڑھ کر بہت ہنسی آئی (صالحہ ناز کراچی)

میں پہلی مرتبہ تعلیم و تربیت کو خط لکھ رہی ہوں۔ یہ میرا بہترین رسالہ ہے۔ گھر میں چھوٹے بڑے سبھی اسے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس کی ہر کہانی اپنی مثال آپ ہوتی ہے (سحر انور لاہور)

انمول انتخاب، انوکھا محسن اور دل نہیں مانتا پسند آئیں۔ دھوپ چھاؤں کی پانچویں قسط بھی بہت اچھی تھی (عمران مرتضیٰ بوچھال خورد)

کھیلوں کی دنیا میں سعید انور کے ریکارڈز شائع کر کے آپ نے ہمارے دل جیت لیے۔ امید ہے آئندہ بھی آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔ اب اگلے ماہ انضمام الحق یا شاہد آفریدی کے ریکارڈز شائع کریں (ماجد رشید لاہور)

سرورق کوئی خاص نہ تھا۔ کہانیاں تمام ہی اچھی تھیں لیکن شکریہ بچے، انوکھا محسن، الزام اور انمول انتخاب نمبر لے گئیں۔ کھیلوں کی دنیا میں سعید انور کے بارے میں معلومات پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ دلچسپ کھیل بغیر خرچ کے بہت ہی زیادہ پسند آئے (محمد طارق ڈیرہ اسماعیل خان)

سرورق ہمیشہ کی طرح حسین تھا۔ کہانیاں لاجواب تھیں۔ خلائی کان اور کھالو نامرادو ابہت پسند آئیں (عائشہ بانو اسلام آباد)

اکتوبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ان میں شکریہ بچے، انوکھا محسن، الزام اور دھوپ چھاؤں بہت پسند آئیں۔ ملا نصر الدین کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ لطیفے بہت دلچسپ تھے (نجمہ شبیر اسلام آباد)

اس دفعہ کے شمارے میں سبھی کہانیاں بہت اچھی تھیں لیکن انمول انتخاب، انوکھا محسن، خلائی کان اور الزام خاص طور پر پسند آئیں۔ سعید انور کے بارے میں پڑھ کر مزہ آگیا۔ نیا سلسلہ "دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے" بھی اچھا ہے (محمد اکرم نیو ملتان)

سرورق بہت خوبصورت تھا۔ کہانیاں سب اچھی تھیں۔ کھیلوں کی دنیا میں اسی طرح نامور کھلاڑیوں کا کریئر بیان کیے جائیں۔ "دلچسپ کھیل بغیر خرچ کے" سلسلے کو آگے بڑھایا جائے (محمد الیاس خواجہ جلال پور پیروالا)

سرورق دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے بہت اچھا سلسلہ ہے۔ کہانیوں میں الزام بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ خلائی کان نے معلومات میں بہت اضافہ کیا (عابد علی چشتیاں)

انمول انتخاب لاجواب تحریر تھی۔ البتہ ٹائٹل میں کوئی نیا پن محسوس نہ ہوا۔ دلچسپ کھیل بغیر خرچ کے پسند آئے (سمیہ ناز خوشاب)

اکتوبر کا شمارہ بہت دلچسپ تھا۔ نظم "غصہ" بہت شان دار تھی۔ کہانی انوکھا محسن بہت پسند آئی، اس کے علاوہ دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے بہت پسند آئے (طٰہٰ طارق کھاریاں چھاؤنی)

اس بار رسالہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں الزام، انوکھا محسن، گھونسلا، دل نہیں مانتا اور انمول انتخاب دل چسپ تھیں۔ خلائی کان اور ناقابل یقین بہت معلوماتی اور دل چسپ تھے (محمد ندیم خان راول پنڈی)

اکتوبر کا شمارہ پسند آیا۔ سب سلسلے اچھے تھے۔ رسالے کی ترقی کے لئے دعاگو ہوں (سید حسن عباس الحسینی شیر کوٹ کوہاٹ)

سرورق بہت خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں شکریہ بچے، کھالو نامرادو، خلائی کان اور کھیلوں کی دنیا میں سعید انور کے ریکارڈز پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ انوکھے محسن نے رسالے کو چار چاند لگا دیے (فہیم رانا لاہور)

اکتوبر کا شمارہ ہر لحاظ سے زبردست تھا۔ سرورق نہایت خوبصورت اور دلکش تھا۔ نظموں میں غصہ اور اکتوبر آیا رت بدلی شان دار تھیں۔ کہانیوں میں نجمہ معراج صاحبہ کی انوکھا محسن، سلیم خان گمی کی دل نہیں مانتا اور اشفاق احمد کی شکریہ بچے بہت پسند آئیں۔ خلائی کان سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے بہت اچھے لگے (محمد سمیرار شاد جھنگ صدر)

اس دفعہ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ سرورق بھی بہت شان دار تھا۔ کھیلوں کی دنیا میں شاہد آفریدی کا انٹرویو تصویر کے ساتھ شائع کریں۔ (احسن مصطفیٰ، عمیر جمشید وزیر آباد)

میں نے آپ کا تعلیم و تربیت کوئی آٹھ مہینوں سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ یہ مجھے اتنا اچھا لگتا ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی جی نہیں بھرتا۔ ساری کہانیاں زبردست ہوتی ہیں۔ شرارتی لکیریں کچھ خاص نہیں ہوتیں، مگر لطائف بہت اچھے ہوتے ہیں (حرا فاروقی کراچی)

اکتوبر کا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ انمول انتخاب، خلائی کان، الزام اور کھالو نامرادو بہت پسند آئیں۔ دھوپ چھاؤں (ناول) بہت اچھا جا رہا ہے۔ سلسلہ کھیل بغیر خرچ کے بہت اچھا لگا (صفیہ ضیا ہارون آباد)

اکتوبر کا شمارہ بہترین تھا۔ البتہ سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ کہانیوں میں

انمول انتخاب' انوکھا محسن اور دل نہیں مانتا بہترین تھیں۔ کہانیوں کی لکھائی تھوڑی باریک کریں تاکہ زیادہ کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ دلچسپ اور ناقابل یقین کا سلسلہ زبردست جارہا ہے (محمد عرفان آفریدی کوہاٹ)

بخت رساصاحبہ اور فوزیہ طاہرہ صاحبہ کیا آپ سے ناراض ہیں؟ اگر ناراض ہیں تو جلدی منائیں ورنہ ہم ناراض ہو جائیں گے (حسن اکبر اشتیاق یوسف پیلپاں)

اکتوبر کی کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص طور پر الزام' کھا لو نامرادو' گھونسلا' خلائی کان اور انمول انتخاب سرفہرست رہیں۔ باتیں بڑوں کی کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں (مدیحہ اشرف ملک لاہور)

سرورق خوبصورت تھا۔ تمام کہانیاں سبق آموز تھیں۔ دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے اور کھیلوں کی دنیا زیادہ پسند آئے (بلال رؤف لاہور)

آپ نے سعید انور کا انٹرویو شائع کیا' پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں دل نہیں مانتا اور الزام بہت پسند آئیں۔ مجرم کون کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ وہ میرا پسندیدہ سلسلہ تھا (سید طاہر علی لاہور)

اکتوبر کا پیارا راج دلارا تعلیم و تربیت ملا۔ ٹائٹیل خوبصورت تھا۔ اداریے میں دل چسپ کھیل کا پڑھ کر سب سے پہلے وہی نکالے اور ہمیں بے حد پسند آئے۔ اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے۔ کہانیوں میں ہمیں انمول انتخاب' شکریہ بچے اور کھالو نامرادو بہت پسند آئیں۔ جب کہ خلائی کان نے ہمیں کافی متاثر کیا۔ دل نہیں مانتا میں اتنے کردار ڈالے ہوئے تھے کہ ہمیں سمجھ ہی نہیں آئی۔ البتہ نظمیں دونوں ہی بہت پسند آئیں۔ سعید انور کے ریکارڈ نے ہمیں کافی متاثر کیا۔ دھوپ چھاؤں بہت اچھی جارہی ہے اور اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے (عیرہ لطیف فیصل آباد)

اس شمارے میں نجمہ معراج کی کہانی انوکھا محسن پسند آئی۔ البتہ سرورق خاص نہ تھا۔ قائداعظم کلاسک زبردست ہے۔ دل چسپ کھیل پسند نہیں آئے (آمنہ مصطفےٰ رفیق لاہور)

سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ آپ نے جو دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے شروع کئے ہیں بہت اچھے ہیں۔ انہیں ہر ماہ شائع کیا کریں۔ اس طرح ہم نئے کھیلوں سے واقف ہوں گے (صبیح الحسن پشاور)

شکریہ بچے' انوکھا محسن اور دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے زبردست تھے۔ باقی کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں (روبینہ حمید راول پنڈی)

تعلیم و تربیت ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس کی کہانیوں کا معیار اچھا ہے۔ خاص طور پر اسلامی تاریخ پر لکھی جانی والی تحریریں دل کو بہت طمانیت اور ذہنی سکون عطا کرتی ہیں۔ اس ماہ کی کہانی انمول انتخاب نے دل کو مسرور کرنے کے ساتھ ساتھ عظیم صحابی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق معلومات دیں۔ شکریہ بچے اور انوکھا محسن بہت پسند آئیں۔ دل چسپ اور ناقابل یقین سبھی قابل تحسین تھے (عائشہ عباس میانوالی)

اس دفعہ سعید انور کے انٹرویو نے رسالے کو چار چاند لگا دیئے۔ اس کے علاوہ انمول انتخاب' شکریہ بچے اور انوکھا محسن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لطائف کی کیا بات ہے۔ تعلیم و تربیت واقعی نمبرون ہے (حافظ اظہر فاروق چیچہ وطنی)

اکتوبر کا شمارہ بہت مزے دار تھا۔ کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص طور پر انوکھا محسن اور دل نہیں مانتا تو بہت پسند آئیں۔ سعید انور کے بارے میں معلومات پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہاکی کے کھلاڑیوں کے بارے میں بھی معلومات شائع کریں (محمد عمار ملتان)

تمام کہانیاں اچھی تھیں مگر شکریہ بچے' الزام اور دل نہیں مانا بہت اچھی تھیں۔ دھوپ چھاؤں کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ نظموں میں اکبر آیا رت بدلی بہت مزے دار تھی (رفیع اللہ مروت ڈیرہ اسماعیل خان)

تین چار ماہ سے تعلیم و تربیت کے سرورق دل چسپ اور اب صورت آرہے ہیں۔ یہ صرف میرا ہی خیال نہیں بلکہ آپ قارئین کے خطوط سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس ماہ بھی سب سلسلے اپنی مثال آپ تھے۔ جو سلسلے مجھے زیادہ اچھے لگتے ہیں وہ شرارتی لکیریں اور آیئے مسکرائیں ہیں۔ آپ نے اس ماہ سے نیا سلسلہ شروع کیا ہے جس کا نام ہے دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے۔ میری طرف سے آپ کو ڈھیروں مبارک باد۔ میری تجویز ہے کہ اسے جاری رکھا جائے۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس میں ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے۔ نجمہ معراج صاحبہ کی کہانیاں مجھے بہت پسند ہیں (رابعہ شرف الدین پشاور)

سرورق پسند آیا۔ کہانیاں تمام اچھی تھیں۔ نظم اکتوبر آیا رت بدلی نمبر ون تھی (محمد طاہر عمران ڈیرہ اسماعیل خان)

اکتوبر کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ سعید انور پر مضمون واقعی زبردست تھا۔ اس کے علاوہ کہانیوں میں انمول انتخاب' الزام اور دھوپ چھاؤں زبردست رہیں۔ "کھیل بغیر خرچ کے" اور دل چسپ اور ناقابل یقین بہت عمدہ تھے (محمد سلمان بن منور لاہور)

تعلیم و تربیت کے لئے میری چند تجاویز ہیں۔ سرورق پر ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر کے بجائے کوئی نیچرل تصویر دیا کریں۔ آپ بھی لکھنے میں ناقابل اشاعت تحریروں کا کالم بھی دیا کریں۔ آپ کا خط ملا میں انعامی خط کا سلسلہ شروع کریں اور جن ساتھیوں کے خطوط شائع نہ ہو سکیں ان کے ناموں کی فہرست ہی دے دیا کریں (حافظ نصیر بیگ پیلپالہ)

سرورق بہترین تھا۔ کہانیوں میں انوکھا محسن' شکریہ بچے اور خلائی کان

بہت اچھی تھیں۔ ہونہار فوٹو گرافر کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے (فرقان اقبال 20: رب باؤ والا)

اس دفعہ بھی میرا دوست مجھے بہت پسند آیا۔ یہی تو ایک میرا سچا دوست ہے۔ جس میں وفاداری، پاکیزگی اور خلوص جیسی خوبیاں ہیں اور یہی ایک واحد دوست ہے جس نے صحیح معنوں میں دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ جی ہاں یہ ہے تعلیم و تربیت! یہ ہے ہی اتنا اچھا (کرن اسلم بہاول پور)

ن تعلیم و تربیت پچھلے ایک سال سے پڑھ رہا ہوں لیکن خط پہلی مرتبہ لکھ رہا ہوں۔ اکتوبر کی سب کہانیاں اچھی تھیں۔ دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے، کیلوں کی دنیا اور کہانی دل نہیں مانتا کا تو جواب ہی نہیں۔ آئیے مسکرائیں، کارٹون کہانی اور شرارتی لکیریں پڑھ کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ آپ جلدی سے چٹ پٹے مسالے دار، چچا بھلکڑ اور مجرم کون؟ کے سلسلے شروع کریں (رضوان شہزاد راولپنڈی)

اکتوبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں الزام، دل نہیں مانتا اور کھالو نامرد بہت اچھی لگیں۔ کرکٹ کے عالمی ریکارڈز پڑھ کر بہت معلومات حاصل ہوئیں۔ آپ شاہد آفریدی کا انٹرویو بھی شائع کریں (وقار عظیم مرزا نواب آباد)

اکتوبر کا شمارہ بہت دلچسپ تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ مگر دل نہیں مانتا اور شکریہ بچے بہت پسند آئیں۔ ملا جی نے تو کمال ہی کر دیا۔ مجرم کون اور ہونہار فوٹو گرافر کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ اس کے علاوہ دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے جاری رکھیں (احمد علی سرگودھا)

کہانیوں میں انمول انتخاب، دل نہیں مانتا اور انوکھا محسن اچھی لگیں۔ آپ کو اتنے ساتھیوں نے کہا ہے کہ مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں لیکن آپ نے ہماری بات نہیں مانی، آخر کیوں (محمد عمر ذوالفقار لاہور)

اکتوبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں الزام، انوکھا محسن اور انمول انتخاب بہت پسند آئیں۔ نظم اکتوبر آیا رت بدلی بھی اچھی تھی۔ کھیل بغیر خرچ کے سلسلہ بہت اچھا ہے (عائشہ سعید حضرو)

اکتوبر کے شمارے میں نمبر5 پر "خلائی کان" نمبر4 پر "دل نہیں مانتا" نمبر3 پر "انمول انتخاب" نمبر2 پر "دھوپ چھاؤں" اور نمبر1 پر "شکریہ بچے" تھیں۔ نیا سلسلہ دلچسپ تھا۔ مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں۔ آپ بھی لکھے میں غدار اچھی تحریر تھی۔ ٹائٹل پر تھوڑی اور محنت کریں "دوزخ سے فرار" کا انتظار رہے گا (ضیغم عباس جلال پور جٹاں)

تعلیم و تربیت کا معیار روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور یہ ایک معلوماتی اور تفریحی رسالہ ہے۔ سرورق بہت ہی اچھا تھا۔ کھیلوں کی دنیا میں سعید انور کے ریکارڈز پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ کہانیوں میں انوکھا محسن اور لکڑ بگے کے بارے میں معلومات اچھی تھیں اور بغیر خرچ کے کھیل بہت ہی پسند آئے (محمد خان عادل رکھی میانوالی)

ٹائیٹل واقعی شاندار تھا۔ لطیفے بھی بہت شاندار تھے۔ ملا نے اپنے شکار کی وجہ سے بہت ہنسایا۔ آپ نے اقوال زریں کا سلسلہ کیوں بند کر دیا ہے براہ مہربانی اس کو دوبارہ شروع کریں (واجدہ سعید بہاول پور)

سرورق بہت شان دار تھا۔ کرکٹ میں سینچری میکر، الزام، انوکھا محسن اور دل نہیں مانتا بہت پسند آئیں۔ آپ مجرم کون کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ دل چسپ کھیل بہت زیادہ پسند آئے (مدثر نعیم بورے والا)

اس ماہ کا تعلیم و تربیت خلاف معمول 30 تاریخ ہی کو مل گیا۔ سرورق مزے دار نہ تھا۔ نظمیں دونوں مزے دار تھیں۔ کہانیوں میں انوکھا محسن، دل نہیں مانتا اور الزام بہت مزے دار تھیں نیز مضمون خلائی کان بھی اچھا تھا (محمد جبران اقبال صدیقی میرپور خاص)

میں نے تعلیم و تربیت کو آج سے 5 سال پہلے اپنے دوست کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد اب تک اس کا خریدار ہوں۔ اس بار سرورق بہت خوبصورت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوہ مری یا چترال کا کوئی خوبصورت علاقہ ہے۔ اس ماہ پورا تعلیم و تربیت زبردست ہے۔ اگر کسی ایک کہانی یا مضمون کی تعریف کروں تو باقی کے ساتھ ناانصافی ہو گی (طاہر حنیف ڈھوک موہری)

اکتوبر کا تعلیم و تربیت ہمیشہ کی طرح بہترین سرورق کے ساتھ تھا۔ کہانیاں تمام بہترین رہیں (محمد مجتبیٰ خان میرپور خاص)

مجھے تعلیم و تربیت پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میں اس کی ہر چیز پسند کرتا ہوں لیکن میں قائداعظم کلاسک زیادہ پسند کرتا ہوں کیونکہ اس سے مجھے قائداعظم کی زندگی کے بارے میں پتا چلتا ہے (علی عارف لاہور)

یوں تو سب ہی کہانیاں اچھی لگیں لیکن شکریہ بچے، الزام، گھونسلا، دل نہیں مانتا اور دھوپ چھاؤں کی پانچویں قسط بہت اچھی لگیں۔ نظم اکتوبر آیا رت بدلی بہت اچھی لگی (محمد رضوان خوشاب)

اکتوبر کا رسالہ بہت پسند آیا۔ خاص کر قرآن حکیم کے سلسلے میں "مایوس نہ ہوں" پڑھ کر بہت سکون ملا۔ کیونکہ ان دنوں میری اپنی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ باقی تمام رسالہ بھی بہت اچھا تھا۔ دل چسپ کھیل بھی بہت پسند آئے (جواد اشرف ملک واہ چھاؤنی)

رسالہ لاجواب تھا۔ سب کی سب کہانیاں اچھی تھیں۔ ایک شعر اپنے محبوب رسالے کی شان میں عرض ہے ؎

تیری خوشبو نہیں ملتی تیرا لہجہ نہیں ملتا
ہمیں تو شہر میں کوئی تیرے جیسا نہیں ملتا

(عابد رضا سومرو سکھر)

خالی جگہ پر کیجئے اور 450 روپے کی کتابیں لیجئے۔

ایک سے زائد اور سات سے کم حل موصول ہونے کی صورت میں انعامات مساوی مالیت میں دیئے جائیں گے۔ سات یا سات سے زیادہ حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا اور چھ انعام بالترتیب 100، 90، 80، 70، 60 اور 50 روپے کی مالیت کی کتابوں کے دیئے جائیں گے۔

یہ جملے اسی شمارے میں چھپی ہوئی عبارت سے لیے گئے ہیں۔

1۔ جب اس نے ان کو دیکھا تو ------ کربولا

2۔ ------ کا آغاز ہونے والا تھا

3۔ جو ------ رہ جاتے ہیں انہیں گن لیا جاتا ہے

4۔ ------ اپنی منزل پائیں گے

5۔ ہمارے ہاں ------ کا پہلے ہی قحط ہے

6۔ ------ میں قرآن کا مطلب خوب ہمیں سمجھایا

7۔ وہ اس بات سے ایک طرح خوش تھے کہ خدمت کے لیے ایسا ----- لڑکا مل گیا ہے

8۔ اس نے ----- کا نعرہ مارا

9۔ انہوں نے مجھے دو دن تک -------- رکھا تھا

10۔ سبھی گھر والے اس ------ کو تکتے

جوابات داؤدی علمی آزمائش اکتوبر 1998ء

(1) فضول وہم (2) میرا باپ (3) عجب (4) پتنگ (5) سعید انور (6) مجرم (7) بیکن آن (8) انصاف (9) بیڈ (10) پابندیوں

اس ماہ 590 ساتھیوں کے بالکل درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے ان چھ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیئے جارہے ہیں۔

○ پہلا انعام: فریحہ گوہر فیصل آباد (100 روپے کی کتابیں)

○ دوسرا انعام: صالحہ ناز عبدالرزاق کراچی (90 روپے کی کتابیں)

○ تیسرا انعام: زین علی شورکوٹ (80 روپے کی کتابیں)

○ چوتھا انعام: جواد پاشا لاہور (70 روپے کی کتابیں)

○ پانچواں انعام: عدنان فاضل چک بختاور (60 روپے کی کتابیں)

○ چھٹا انعام: محمد مزمل نعمان بڈھ بیر (50 روپے کی کتابیں)

ان ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کئے جارہے ہیں: محمد عمر نعیم جھنگ صدر۔ فائزہ شریف پشاور۔ حسیب ناصر لاہور۔ مہروز محمود ساگری جہلم۔ ابوبکر صالح کوٹ چٹھہ۔ مدیحہ ڈیوڈ خانیوال۔ امتیاز الحسن طاہر تلونڈی گوجرانوالہ۔ پرنس عاصم غفور پائلٹ بہاول پور۔ محمد نوید انجم قصور۔ چودھری شجاعت علی ساگر غازی چک۔ ذوالفقار حیدر راجپوت سنجھورو۔ محمد الیاس خواجہ جلال پور پیروالا۔ سبین بیگ لاہور۔ یسرہ رضی لاہور۔ زینب اختر کراچی۔ سدرہ حنیف فیصل آباد۔ عاصم مسعود لاہور۔ رابعہ خان فیصل آباد۔ تابندہ مطیع لاہور۔ محمد عمر شہباز راول پنڈی۔ محمد طارق محمود اوکاڑہ۔ سدرہ جمال فیصل آباد۔ نزہت عنبرین ڈیرہ اسماعیل خان۔ صابرہ رحمان لاہور۔ مہوش ایوب لاہور۔ ثوبیہ ادریس فیصل آباد۔ مریم سبین لاہور۔ تقی حیدر خان بھلوال۔ محمد طاہر حنیف جہلم۔ حنا ظفر سرگودھا۔ صوبیہ انور عارف والا۔ نعمان احمد فاروقی لاہور۔ شمی خاتون لاہور۔ عمران ایوب لاہور۔ طاہرہ یعقوب لاہور۔ الیاس احمد وہاڑی۔ مکرم علی میرپور۔ سید ذیشان حیدر وہاڑی۔ امینہ گل لاہور۔ عبدالرافع لاہور۔ وقار نعیم لاہور۔ عبدالوہاب فضل کریم کھوکھر صادق آباد۔ ملک توصیف احمد فیصل آباد۔ حافظ محمد ضیاء اللہ جٹھول فیصل آباد۔ محمد شاہد سہیل مریدکے۔ ثناء طفیل سیال کوٹ۔ محمد اورنگ زیب لاہور۔ عرفان باغی لاہور۔ زاہد مظہر ذوالفقاری شکردرہ۔ صوبیہ شاہ کوٹ۔ کاشف اقبال سرگودھا۔ مہرالنساء مروت ڈیرہ اسماعیل خان۔ عبدالجبار نصرت خیل۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 7 نومبر

دماغ لڑاؤ

نام _____

مقام _____

پتا _____

_____

اس دوران میں سارے ہندوستان میں مسلمانوں کا جوش و خروش اپنی بلندیوں پر تھا

قائداعظمؒ اور لارڈ ویول کی ملاقات شملہ 1947ء

شملہ کانفرنس 1945ء یا ویول پلان (منصوبہ)

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد لارڈ ویول ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا۔ اب حکومت برطانیہ کا مقصد فوج اور انتظامیہ کو قریب لانا تھا نیز ہندو مسلم سیاسی تناؤ کو ختم کر کے ملکی وحدت کو برقرار رکھنا تھا، اسی دوران میں جنگِ عظیم ختم ہو گئی۔ اب ہندوستان میں سیاسی اصلاح کی تاخیر کا کوئی بہانہ نہیں چل سکتا تھا، چنانچہ 25 جون 1945ء کو شملہ میں مسلم لیگ، کانگریس اور چند دیگر جماعتوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس میں غور کے لیے چند تجاویز پیش کی گئیں۔ اگرچہ ان تجاویز میں مسلمانوں کے تصور پاکستان کو خارج کر دیا گیا لیکن قائدِ اعظمؒ نے اس خیال سے شرکت کی کہ وہ وائسرائے پر مسلمانوں کا نقطۂ نظر واضح کر سکیں، لیکن کانگریس کے اس اصرار پر کہ مسلمانوں کے نمائندے وہ نامزد کرے گی۔ قائد اعظمؒ نے شدید اختلاف کیا۔ کیونکہ ان کی نظر میں اس طرح پاکستان کا مسئلہ پس پُشت ڈال دیا جانا تھا اور کانگریس کو ہندوستان کی متحدہ حکومت حاصل کرنے کا موقع مل جانا تھا۔ آپ نے اس موقعہ پر فرمایا کہ اگر ہم اس تجویز پر متفق ہو جاتے تو گویا موت کی سزا کے حکم پر خود دستخط کرنے کے مترادف ہوتا۔ اس طرح آئینی اصلاحات پر یہ کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی۔

انتخاب 46- 1945ء اور انتقالِ اقتدار

46 - 1945ء میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کے نتیجے میں مسلم لیگ نے 87 فیصد کے حساب سے ۴۹۵ مسلم نشستوں میں 440 نشستیں حاصل کر لیں۔ چناں چہ اس خوشی میں قائدِ اعظمؒ کی قیادت میں مسلم لیگ نے 11 جنوری 1946ء کو یومِ فتح منایا۔ لیکن جب عبوری حکومت قائم کرنے کا وقت آیا تو ہندوؤں نے وائسرائے سے مل کر مختلف قسم کی رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیں۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان حکومت میں شامل ہوں۔

پنڈت نہرو اور دوسرے ہندو رہنما ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول 1946ء کو اپنی سفارشات پیش کر رہے ہیں۔

ٹال مٹول کا سلسلہ لمبا ہوتا گیا چناں چہ حکومت اور کانگریس کے اس رویے کے خلاف قائدِ اعظمؒ نے یومِ راست اقدام (DIRECT ACTION DAY) منانے کا اعلان کیا اور سارے ملک میں جلسے جلوس نکالے گئے۔ مسلمان رہ نماؤں نے اپنے سرکاری خطابات واپس کر دیئے ان اقدامات کے نتیجے میں برطانوی انتظامیہ مشکلات سے دو چار ہوئی اور مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شریک کرنے پر رضا مند ہو گئی۔ عبوری حکومت کا قیام ہندوستان کو متحد رکھنے اور مطالبہ پاکستان کو ٹالنے کی آخری کوشش تھی۔ لیکن قائدِ اعظمؒ کی فراست سے یہ اسکیم بھی ناکام رہی۔

"اس وقت میدان سیاست میں ہندو اور مسلمان کی جنگ ہو رہی ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کون فتح یاب ہوگا۔ علم غیب خدا کو ہے لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے علی الاعلان کہہ سکتا ہوں کہ اگر قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا پر کاربند ہوں اور اس ارشاد کو کبھی فراموش نہ کریں کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت یا کئی طاقتیں مل کر بھی مغلوب نہیں کر سکتیں۔ ہم تعداد میں کم ہونے کے باوجود فتح یاب ہوں گے، جس طرح مٹھی بھر مسلمانوں نے ایران اور روم کی سلطنتوں کے تخت الٹ دیئے۔"

"قائداعظمؒ" 11 جولائی 1946ء حیدر آباد دکن

(باقی آئندہ)

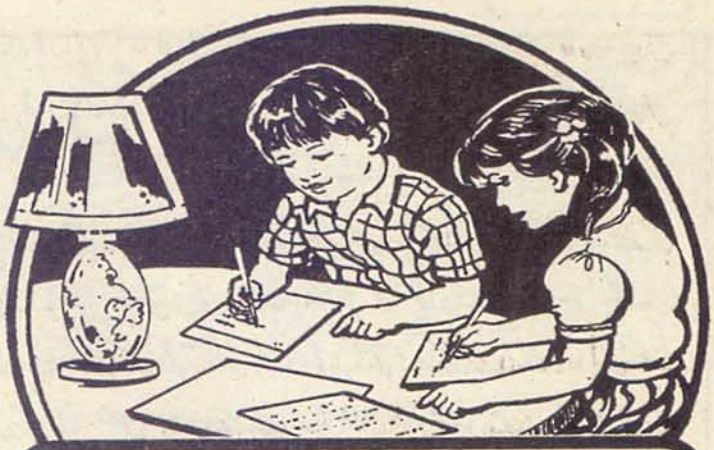

آپ بھی لکھیے

آہ میرے ابو

تعارف اللہ خاوری، راول پنڈی

ہمارا گھرانا پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ امی، ابو، باجی نرگس باجی صائمہ اور میں..... امی ابو کے بعد باجی نرگس گھر میں سب سے بڑی تھیں۔ اس کے بعد باجی صائمہ کا نمبر تھا۔ میں سب سے چھوٹا تھا، اس لیے گھر کے سب ہی افراد مجھ سے محبت کرتے تھے اور ان کی اسی محبت اور لاڈ پیار نے مجھے ضدی اور خود سر بنا دیا تھا۔

ابو صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ اپنے خون پسینے کی کمائی سے میری ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرتے تھے۔ کبھی انہوں نے سوائے ایک بار کے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ تم کیوں اتنی فضول خرچی کرتے ہو اور نہ ہی کبھی مجھے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ وہ فیکٹری میں کام کر کر کے تھک جاتے ہیں اور میں ان کی خون پسینے کی تنخواہ میں سے آدھی سے بھی زیادہ اللوں تللوں میں اجاڑ دیتا ہوں۔ میں جو کچھ بھی کہتا ابو وہ خوشی خوشی کرتے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اس خوشی کے پیچھے کتنے غم چھپے ہیں اور کتنی خواہشیں چھپی ہوئی ہیں ان کے دل میں، مثلاً باجی نرگس کی شادی ان کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

ایک دن ابو فیکٹری سے آئے تو ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ ہلکی کھانسی بھی تھی۔ جیسے ہی ابو گھر میں داخل ہوئے میں نے ان سے کہا "ابو میرے لیے گھڑی لائے ہیں.....؟"

ابو نے کہا "ادھر آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ!"

میں ابو کے پاس بیٹھ گیا اور دوبارہ پوچھا "ابو گھڑی لائے ہیں کہ نہیں؟ میں نے آپ سے کہا تھا کہ کل گھڑی ضرور لانا؟"

ابو نے کہا "دیکھو بیٹے، میں صبح سے شام تک فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ تاکہ تم تعلیم حاصل کر سکو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بڑے آدمی بن جاؤ، بہت بڑے آدمی۔ اور ملک و قوم کی خدمت کرو، اس کا نام روشن کرو۔ پھر ابو بولے "کبھی تم نے یہ سوچا کہ میں کتنی محنت سے پیسے کماتا ہوں اور تم اسے اپنی فضول خواہشیں پوری کرنے پر خرچ کر دیتے ہو۔ میں نے کبھی تمہاری کوئی خواہش رد نہیں کی۔ لیکن میرے بیٹے، اب میں کمزور ہو چکا ہوں۔ میرے بازوؤں میں پہلے جیسی طاقت نہیں رہی۔ اب میں اتنا کام نہیں کر سکتا جتنا پہلے کرتا تھا۔ ماشاء اللہ اب تم سمجھ دار بھی ہو گئے ہو۔ جانتے ہو کہ ہمارا گزارہ بمشکل ہوتا ہے۔ اس لیے تم ایسی فرمائشیں نہ کیا کرو جو ہم پوری نہ کر سکیں"۔

"نہیں میں تو گھڑی ضرور لوں گا" میں نے ابو سے کہا اور ساتھ ہی رو پڑا۔

تھوڑی دیر بعد باجی نرگس کمرے میں آئیں۔ انہوں نے مجھے چپ کرایا اور مجھ سے کہنے لگیں "دیکھو ابو بیمار ہیں۔ ان کو تنگ نہ کرو۔ ورنہ ان کی بیماری بڑھ جائے گی۔ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرو تاکہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔ پھر وہ تمہیں گھڑی لے دیں گے"۔

"نہیں مجھے تو اس وقت گھڑی چاہیے" یہ کہہ کر میں پھر رونے لگا۔

مجھے روتے دیکھ کر ابو نے جیب سے پیسے نکالے اور باجی نرگس سے کہا "میں نے دوائی کے لیے رکھے تھے لیکن یہ رو رہا ہے اس لیے یہ پیسے اسے دے دو تاکہ یہ اپنے لیے گھڑی خرید لے"۔

پیسے لے کر میں نے گھڑی خریدی اور اپنے دوستوں کو دکھائی اور خوب تعریفیں وصول کیں۔

ابو کا حال روز بروز خراب ہوتا جا رہا تھا۔ علاج کے لیے پیسے بھی نہیں تھے۔ ایک رات تو ابو کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ صبح مختلف لوگوں کے رونے کی آواز کے ساتھ میری آنکھ کھلی تو دیکھا۔

ابو چارپائی پر بے سدھ پڑے تھے۔ امی، نرگس، صائمہ اور محلے کی کچھ عورتیں چارپائی کے گرد بیٹھی تھیں۔ باجی نرگس اور امی نے رو رو کر اپنا برا حال کیا تھا۔ انہیں روتے دیکھ کر میں بھی رو پڑا۔ باجی نرگس نے مجھ سے کہا "خوش ہو جا تجھے تو اپنی خواہشیں عزیز ہیں۔ تمہیں ابو سے ذرا سا بھی پیار ہوتا تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔ دوائی کے پیسوں سے تو نے گھڑی خرید لی اس لیے ابو ہم سے ہمیشہ کے لیے دور چلے گئے" وہ سسکیوں کے درمیان بولتی جا رہی تھی۔

یہ باتیں اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ لیکن اب جب کہ میں بڑا ہو گیا ہوں۔ باجی نرگس کی یہ باتیں میرے ذہن میں ہتھوڑے برساتی ہیں اور میں خود کو واقعی ابو کا قاتل سمجھتا ہوں۔ احساس ندامت سے میرا جھکا ہوا سر شاید کبھی نہ اٹھ سکے۔ اب مجھے احساس ہو چکا تھا کہ گھر کا سارا بوجھ میرے کاندھوں کے اوپر آ پڑا ہے۔ وقت کا دھارا تیزی کے ساتھ بہتا رہا۔ میری زندگی میں ایک انقلاب آ چکا تھا۔ میں اب اپنی تعلیم پر توجہ بھی دیتا تھا اور اسکول سے واپسی کے بعد میں نے محلے کی ایک دکان پر کام کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ 10 سال بعد میں نے ایم اے اچھے نمبروں سے کر لیا۔

ایم اے کرنے کے بعد مجھے ایک اچھی جگہ نوکری مل گئی۔ سات ہزار روپے ماہوار پر۔ اب مجھے بڑی باجی کی شادی کی فکر دامن گیر تھی۔ جو کہ ابو کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ سو میں نے کچھ پیسے خود جمع کیے اور کچھ اپنے دوستوں سے قرض لیے اور باجی نرگس کی شادی کی۔ یوں باجی کی شادی تو ہو گئی مگر اس میں ابو شریک نہیں تھے۔ جس کا مجھے بے حد دکھ ہے اور رہے گا۔

دو سال کے بعد باجی صائمہ کی شادی بھی ہو گئی اور میں بڑا آدمی بھی بن گیا۔ لیکن میں بالکل تنہا رہ گیا۔ کبھی کبھی مجھے ابو یاد آ جاتے ہیں تو میں ان کی قبر پر چلا جاتا ہوں اور دیر تک روتا رہتا ہوں میرا ضمیر مجھے سزاوار بھی ٹھہراتا ہے اور ملامت بھی کرتا ہے کہ کاش میں ایسا نہ کرتا (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

عظیم سعادت

محمد عدیل دانش، کراچی

یہ فلسطین کا علاقہ مقبوضہ غزہ ہے جو گزشتہ کئی برسوں سے تنظیم آزادی "حماس" کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور جہادی کارروائیوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں مجاہدین اور اسرائیلی فوجیوں کے درمیان جھڑپیں روز کا معمول بن گیا ہے۔ مجاہدین تا حال پتھروں سے اسرائیلی فوج کے خلاف برسرپیکار ہیں اور دوسری طرف اسرائیلی فوج خود کار اسلحے سے لیس ہے۔

اگرچہ میرا مجاہدین کی کسی تنظیم سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہے مگر میں پھر بھی وہاں کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی ضرور حمایت کرتا ہوں۔ مجھے اس علاقے میں رہتے ہوئے کئی ماہ و سال ہو گئے ہیں۔ میں جب بھی کام پر جاتے ہوئے بازار سے گزرتا تو چوک کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے اخبار فروش بچے سے اخبار خرید کر ضرور پڑھتا۔

وہ بچہ جس کی عمر تقریباً تیرہ سال کے قریب ہو گی، زیادہ وقت اپنے آپ میں گم رہتا۔ شاید میں اس کی اسی عادت کی وجہ سے دو تین اخبار فروشوں کو چھوڑ کر اس ہی سے اخبار خریدتا تھا۔ وہ بھی چند ہی دنوں میں مجھ سے مانوس ہو گیا تھا۔ اس لیے مجھے اخبار پڑھتے دیکھتے ہی باآواز اخبار پڑھ کر سنانے کا مطالبہ کرتا۔ تاکہ وہ بھی تازہ حالات سے باخبر رہ سکے۔ چونکہ وہ خود پڑھنے لکھنے سے قاصر تھا اس لیے میں اس کی یہ خواہش کسی حد تک پوری کر سکتا تھا۔ وہ اخبار سننے کے بعد کر مختلف انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے روزمرہ کے معمولات میں تبدیلی آ گئی۔ مگر میں پھر بھی بلاناغہ اس کے پاس جاتا، اخبار پڑھتا اور اسے بھی پڑھ کر سناتا۔ رمضان کے دن بھی سال کے دیگر مہینوں کے ایام کی طرح بلا تاخیر گزرنے لگے۔

جمعہ 25 فروری 1996ء کو فلسطین کے ایک شہر میں مسلمانوں پر ہونے والی وحشیانہ فائرنگ کے خلاف فلسطین کا بچہ بچہ سراپا احتجاج بن گیا۔ ہر جگہ جلسے جلوس اور مظاہرے ہو رہے تھے۔ جس کی وجہ سے اکثر جگہوں پر کرفیو نافذ رہتا۔ اس لیے کئی روز تک میری اس ننھے اخبار فروش سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کئی دن بعد میں بازار سے گزرا تو اس کے پاس گیا۔ مجھے آتے دیکھ کر ہی اس نے 26 تاریخ کا اخبار نکال کر دیا اور پڑھ کر سنانے کو کہا۔ میں اخبار سناتا رہا۔ میں نے جب اسے باروخ گولڈ اسٹائن کے بارے میں بتایا کہ یہ وہ

یہودی ہے جس کی شرانگیز تقریر پر یہودیوں نے کئی مسلمانوں کو شہید کردیا ہے۔ تو یہ سنتے ہی اس کا چہرہ غم و غصے سے سرخ ہوگیا۔ مگر اس نے غصے کے اظہار کے بجائے خاموش ہی رہنا چاہا۔ اس کے بعد میں نے تازہ اخبار بھی پڑھ کر سنایا۔

اچانک وہ مجھ سے کہنے لگا "مسلمان نماز پڑھتے ہیں اس لیے یہودی ان کو شہید کرتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ شہید کا اللہ کے ہاں بڑا بلند درجہ ہے۔ میں بھی باقاعدگی سے نماز پڑھوں گا اور اپنی شہادت کے لیے دعا کروں گا تاکہ مجھے بھی یہ سعادت نصیب ہو"۔

پھر وہ کہنے لگا "آپ تو پڑھے لکھے ہیں۔ لکھ سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی یہودیوں کے مظالم کے خلاف اخبار میں لکھیں"۔

"ٹھیک ہے لکھوں گا" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پھر یہ سلسلہ چلتا رہا اور وہ روزانہ اصرار کرتا رہا کہ میں یہودیوں کے مظالم کے خلاف اخبار میں کچھ لکھوں اور میں آج اور کل پر ٹالتا رہا مگر مسلسل ٹال مٹول بھی میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ آج جب میں بازار سے گزرنے لگا تو سوچا کہ وہ پھر وہی سوال کرے گا اور مجھے پھر اس کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں پلٹا اور دوسرے اخبار فروش کے پاس گیا۔

اچانک اخبار پڑھتے پڑھتے میری نظر ایک بچے کی تصویر پر آکر رک گئی۔ یہ تو اسی کی تصویر تھی۔ نیچے مختصر تحریر سی تھی جسے میں بڑے انہماک سے پڑھنے لگا "اسرائیلی فوج کی گاڑی جو کہ مقبوضہ غزہ کے علاقہ میں بازار سے گزر رہی تھی، پر پتھراؤں کے جرم میں ہی یہ لڑکا گولیوں کا نشانہ بنا"۔ میں اخبار پڑھتا چلا جارہا تھا اور آنکھیں بے اختیار نم ہوتی چلی گئیں۔ مجھے اس کی شخصیت پر رشک آنے لگا۔ کیونکہ وہ عظیم بچہ عظیم سعادت حاصل کرچکا تھا (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

ہوم ورک

زاہدہ پروین، کراچی

"یہ دیکھو میں نے کتنا اچھا مضمون لکھا ہے" حارث میاں نے اپنی کاپی کھولتے ہوئے سعید سے کہا۔

"دکھاؤ....." سعید ان کی کاپی تھام کر مضمون پڑھنے لگا۔

"یہ تم نے خود لکھا ہے؟" سعید نے حیرت سے پوچھا۔

"یقین نہیں آرہا نا!" حارث میاں اترا کر بولے "رات بارہ بجے تک جاگ کر یہ لکھتا رہا ہوں"۔

"دیکھو منیر، حارث کا مضمون کتنا زبردست ہے" سعید نے اپنے آگے بیٹھے ہوئے لڑکے کی منیر کے سامنے کاپی رکھ دی۔

"واقعی یار بہت اچھا ہے" اس نے کھل کر داد دی اور حارث میاں کا سیروں خون بڑھ گیا۔ یہی تعریف تو ہے جو انسان میں اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ اس وقت حارث میاں بھی اپنے آپ کو کوئی اعلیٰ چیز سمجھ رہے تھے۔ جب ان کی کاپی پوری کلاس میں گھوم رہی تھی اور سب لڑکے ان کے مضمون سے متاثر نظر آرہے تھے۔ انہوں نے واقعی بہت محنت کی تھی۔

"کلاس اسٹینڈ" مانیٹر کی آواز کے ساتھ ہی سب لڑکے کھڑے ہوگئے۔ اردو کے سر کلاس میں داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کتابیں کھولنے کا حکم دیا اور سبق پڑھانا شروع کردیا۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا حارث کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ "سر کاپیاں کیوں نہیں چیک کررہے" انہوں نے جھلا کر سوچا اور اسی وقت پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔

سر کلاس سے جانے لگے تو ایک بچے نے پوچھا "سر! آپ نے مضمون لکھنے کو دیا تھا۔ وہ چیک نہیں کریں گے؟"

سر چونکے اور پھر سوچتے ہوئے بولے "اوہو اب تو وقت نہیں ہے۔ پھر سہی"۔

حارث میاں نے سر کے کلاس سے نکلتے ہی زور سے کاپی بند کرکے میز پر پٹخ دی۔ کتنا ارمان تھا کہ سر مضمون چیک کریں گے اور ساری کلاس کے سامنے ان کی تعریف کریں گے لیکن.....

باقی تمام دن اسکول میں ان کا موڈ آف رہا۔ یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ اردو کے سر کو بھولنے کی عادت تھی۔ تقریباً روزانہ ہوم ورک دیتے لیکن چیک کرنا بھول جاتے۔ ہفتے میں بمشکل ایک دن کاپیاں چیک ہوتی تھیں۔ اس لیے اکثر لڑکے اردو کا کام کرتے ہی نہ تھے اور کچھ تو ایسے بھی تھے جنہوں نے ابھی تک اردو کی کاپیاں بنائی ہی نہیں تھیں۔ بہرحال اس وقت حارث میاں کو وہ بچے بہت

عقل مند لگ رہے تھے جنہوں نے مضمون نہیں لکھا تھا۔

حارث میاں اپنی دانست میں سارا ہوم ورک مکمل کر کے، بستہ بند کر کے، ٹی وی کے سامنے براجمان تھے۔ "اوہ....." جیسے انہیں کچھ یاد آگیا ہو۔ "اردو کا ہوم ورک تو کیا ہی نہیں"۔ وہ اپنے آپ سے گویا ہوئے۔

آج پھر سر نے ایک مضمون لکھنے کو دیا تھا جس کا عنوان تھا۔ "سائنس کی ترقی اور ہم"۔ مضمون تو کچھ اتنا مشکل نہ تھا۔ لیکن اس وقت اپنے پسندیدہ کارٹون کو دیکھتے ہوئے حارث میاں کو یہ مضمون لکھنا مشکل بلکہ ناممکن لگ رہا تھا۔ فرض کی ادائیگی کا احساس بھی تھا اور ٹی وی کے سامنے سے اٹھنے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ آخر شیطان نے بہکایا۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے مضمون لکھنے کی۔ کون سا سر نے چیک کرنا ہے" اور حارث میاں کو یہ بات بہت مناسب لگی لیکن پھر بھی دل میں ڈر تھا "اور اگر سر نے مضمون چیک کر لیا تو....؟"

"آج بھی تو اتنی محنت سے لکھا ہوا مضمون چیک نہیں کیا تھا۔ کل بھی نہیں کریں گے" کچھ شیطان نے قائل کیا اور کچھ اپنا دل بے ایمان تھا۔ سو حارث میاں مطمئن ہو کر وہیں بیٹھے رہے اور سارا دھیان ٹی وی کی طرف لگا دیا۔ ٹی وی کے سامنے سے اٹھے تو آنکھوں میں نیند اتر رہی تھی۔ نماز پڑھی اور فوراً ہی سو گئے۔

صبح ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے اسکول میں داخل ہوئے لیکن پتا نہیں کیا بات تھی آج ان کا دل بہت ڈرا ہوا تھا۔ انہیں بار بار اردو کا مضمون یاد آجاتا تو پریشانی آن گھیرتی۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ "مرد بنو، ڈرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا"۔ اور وہ دس سال کا بچہ مرد بننے کی کوشش میں بہت اطمینان سے چلتا ہوا کلاس روم میں داخل ہوا، حالانکہ اندر سے دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

پہلا پیریڈ حساب کا تھا لیکن حساب کی مس غیر حاضر تھیں۔ سب بچے بہت خوش تھے کہ اب خوب کھیلیں گے۔ لیکن کلاس میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اردو کے سر کلاس میں داخل ہو رہے تھے۔ حارث میاں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو گویا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ انہیں یوں لگا کہ جیسے سر انہی کی طرف آرہے ہیں اور ابھی مضمون نہ لکھنے پر سزا دیں گے۔

سر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے "بچو، آپ کی حساب کی مس غیر حاضر ہیں، آج ان کا پیریڈ بھی میں لوں گا۔ سب بچے اردو کی کتابیں نکالیں"۔ سر نے بھی اپنی کتاب کھولی اور کہنا شروع کیا۔ "آج کا ہمارا اسبق ہے "سائنس اور ہم...." سر بولتے بولتے چونک گئے "میں نے ایک مضمون لکھنے کو دیا تھا، سائنسی ترقی پر، لکھا ہے؟"

"یس سر" بہت سے بچے بیک وقت بولے اور حارث میاں کی تو یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ سر نے کاپیاں چیک کرنا شروع کیں لیکن حارث میاں کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ سر کی آواز پر وہ فوراً کھڑے ہو گئے۔ "یس سر؟"۔

"کاپی دکھاؤ" سر نے حکم دیا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے کاپی سر کی طرف بڑھا دی۔ سر نے ایک نظر مضمون کو دیکھا اور بولے "یہ مضمون تو میں نے کل نہیں دیا تھا"۔

"یس سر" حارث میاں نے تھوک نگلا "یہ پرموں دیا تھا"۔

"کل والا کہاں ہے؟" سر نے گھورا۔

"سر، نہیں لکھا" وہ بمشکل بولے..... اور پھر سر نے باقی نالائق بچوں کے ساتھ انہیں بھی سزا سے نوازا۔ کلاس کے بچے حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے کہ وہ تو بہت لائق تھے یہ آج کیا ہو گیا؟ اور حارث میاں کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ سارا دن اسکول میں حارث میاں کھوئے کھوئے سے رہے۔ انہیں رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے ہوم ورک کیوں نہ کیا؟ کیوں شیطان کی بات مانی؟

گھر آکر انہوں نے ساری رپورٹ امی جان کو پیش کی اور پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولے "امی، آج پہلی بار، زندگی میں پہلی بار میں نے جان بوجھ کر ہوم ورک نہیں کیا تھا اور آج ہی سر نے کاپیاں چیک کر لیں"۔ اس کے ساتھ ہی حارث میاں کی سسکیاں شروع ہو گئیں۔ کیوں کہ انہیں کلاس کے سامنے اٹھائی گئی شرمندگی کا خیال آگیا تھا۔ امی نے آہستہ آہستہ ان کے سر کو سہلایا اور بولیں۔

"بیٹا، شیطان ہمیشہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور ابتدا ایک چھوٹی برائی ہی سے ہوتی ہے۔ انسان اس چھوٹی برائی کا عادی ہوتا ہے اور پھر بے خطر ہو کر بڑی بڑی برائیوں میں مبتلا ہو جاتا

ہے- آپ کو بھی شیطان نے برائی کی راہ پہ ڈالنا چاہا تھا- شکر ہے کہ اللہ میاں نے آغاز ہی میں سزا دے کر آپ کو روک دیا- فرض کریں آج آپ کے سر کاپیاں چیک نہ کرتے تو آپ کل بھی ہوم ورک نہ کرتے پھر پرسوں..... اور اس طرح یہ سلسلہ چل نکلتا"- امی کچھ دیر رکیں- حارث میاں رونا دھونا چھوڑ کر بہت دھیان سے امی جان کی بات سن رہے تھے- امی پھر گویا ہوئیں "اب میرا پیارا سا بیٹا بتائے کہ آئندہ ہوم ورک کرنا ہے یا نہیں"-

"بالکل کرنا ہے اور باقاعدگی سے کرنا ہے- بے شک سر چیک کریں یا نہ کریں"-

"شاباش بیٹا! اور شیطان کی بات بالکل نہیں ماننی" امی نے کہا اور حارث میاں کی پیشانی چوم لی (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

ذرا سی غفلت

امداد علی مینگل، کوئٹہ

دوستو! جس طرح ایک چھوٹا سا سوراخ بڑی کشتی کو ڈبو دیتا ہے- بالکل اسی طرح راکھ کا چھوٹا سا ٹکڑا آگ کا روپ دھار کر بڑے نقصان کا موجب بن سکتا ہے- خوشبوؤں کی ہماری زندگی میں بڑی اہمیت ہے- ہم اپنے لباس کے علاوہ گھروں میں بھی خوشبوؤں کا استعمال کرتے ہیں- مگر وہ لوگ جو قیمتی خوشبوئیں لینے کی استطاعت نہیں رکھتے- ان میں سے اکثر اگر بتیوں سے اپنی دلی خواہش پوری کرتے ہیں- اکثر گھروں میں دیکھا گیا ہے کہ عورتیں دیواروں میں اگر بتیاں لگا کر خود کام کاج میں مصروف ہو جاتی ہیں- جو بڑی خطرناک بات ہے- اس ذرا سی غفلت سے پیدا ہونے والے نقصان کا اندازہ آپ درج ذیل واقعہ سے لگا سکتے ہیں-

اگست کا مہینا اور اتوار کا دن تھا- صائمہ کے ہاں چند مہمان آنے تھے- صائمہ کا خاوند سودا سلف لینے بازار گیا ہوا تھا- جب کہ صائمہ صبح ہی سے گھر کی صفائی ستھرائی میں لگی ہوئی تھی- بیٹھک کی صفائی سے فراغت کے بعد اس نے دو اگر بتیاں سلگا کر اس میں لگا دیں اور خود تھوڑی دیر آرام کی غرض سے دوسرے کمرے کا رخ کیا- زیادہ کام کرنے کی وجہ سے وہ بہت تھک گئی تھیں- اس لیے لیٹتے ہی سو گئیں- جب آنکھ کھلی تو انہیں کمرے میں ہلکا دھواں محسوس ہوا- وہ جیسے ہی کمرے سے باہر نکلیں تو ان کی نظر سامنے بیٹھک سے نکلتے دھوئیں کے بادلوں پر پڑی- پھر وہ پاگلوں کی طرح آگ بجھانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگیں.... چند لمحوں کی محنت کے بعد وہ آگ بجھانے میں کامیاب ہو گئیں- مگر اب وہ اپنی چیزوں کے جل جانے پر افسوس کر رہی تھیں- ان کی ذرا سی غفلت نے کتنا بڑا نقصان کر دیا تھا-

دوستو! ہمیں چاہیے کہ ہم کسی بھی کام میں احتیاط کا دامن ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑیں- کیونکہ ہماری ذرا سی غفلت بڑے نقصان کا پیش خیمہ بن سکتی ہے (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

رسید

کرن اسلم، بہاول پور

"ٹن ٹن ٹن"- پنے چاٹ کی ریڑھی مسلسل گھنٹی بجا رہی تھی اور میرے منہ میں تو جیسے سمندر امڈ آیا ہو- لیکن میری ہفتہ بھر کی پاکٹ منی تو گزشتہ کل سے ختم ہو چکی تھی- ہم بہنوں کو جمعہ کے دن پورے ہفتے کی پاکٹ منی ملتی ہے- میری یہ رقم ایک دو دن میں ہی اڑ جاتی ہے- ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی میری پاکٹ منی غائب ہو چکی تھی لیکن عین اس وقت میری قسمت جاگ اٹھی جب مجھے یاد آیا کہ کچھ دن پہلے صوفیہ نے مجھ سے 10 روپے ادھار لیے تھے- میں فوراً صوفیہ کے پاس پہنچی اور اپنی رقم کا مطالبہ کیا- اس نے صاف انکار کر دیا کہ میں نے لیے ہی نہیں تھے- میں فوراً سپریم کورٹ یعنی امی حضور کے پاس پہنچ گئی- عدالت عالیہ نے فرمایا "تمہارے پاس اس کا ثبوت ہے کہ تم نے صوفیہ کو 10 روپے دیئے تھے؟"

ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے- اب تو ہماری حالت قابل رحم تھی- اس سے پہلے کہ کوئی ہم پر رحم کھاتا اچانک ایک خیال تیر کی طرح ہمارے ذہن میں آیا- ہم نے ایک کاغذ پر لکھا "صوفیہ براہ مہربانی ہمارے 20 روپے واپس کر دو ورنہ ہم ابو سے کہ کر سب کے سامنے نکلوائیں گے"-

ہم نے ابو کے ذریعے نکلوانے کی دھمکی اس لئے دی تھی کہ ہم ابو کے لاڈلے جو ٹھہرے- جب ہماری چھوٹی بہن لبنا یہ کاغذ صوفیہ کے پاس لے کر گئی تو وہ اسے پڑھتے ہی پھڑک اٹھی- اس نے

کاغذ کے دوسری طرف لکھا "کرن جناب جی، کون سے 20 روپے؟ میں نے تو صرف 10 روپے لئے تھے"۔

ہم نے یہ پڑھتے ہی خوشی کا نعرہ لگایا۔ کیوں کہ ہمارے پاس رسید آگئی تھی۔ لہٰذا دوبارہ سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کیا گیا۔ مکمل کارروائی کے بعد ہمیں ہمارے پیسے مل گئے۔ لیکن یہ کیا؟ انہیں مقدموں کے چکر میں چنے چاٹ کی ریڑھی تو کب کی جا چکی تھی اور ہم اپنے منہ کے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے بجائے الماری میں پڑی ہوئی کوزہ مصری سے بند کرنے کی سوچنے لگے

(پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

ایک یادگار سفر

سحرش سلیم، شاہدرہ ٹاؤن

جب ہماری امی جان نے بتایا کہ آپ کی کزن زنیرا کی شادی ہے اور اس کا ولیمہ کراچی میں ہوگا تو یہ سنتے ہی ہماری طبیعت خوش ہوگئی۔ کیوں کہ ہم پہلے ہی روشنیوں کے شہر "کراچی" کی سیر کرنا چاہ رہے تھے۔ دن تیزی سے گزر رہے تھے اور آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب ہمیں کراچی روانہ ہونا تھا۔ ہم نے گاڑی کا ایک ڈبہ بک کروالیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم صرف اپنے گھر والے ہی نہیں بلکہ دوسرے رشتہ دار بھی ہمارے ساتھ شریک سفر تھے۔

سفر شروع ہوا تو ہم سب لڑکیوں نے گانے گانا شروع کیے۔ جس سے سفر میں خوب مزا آیا۔ پھر راستے میں طرح طرح کی چیزیں کھائیں، آرام کیا، لڈو کھیلی اور اپنا پسندیدہ رسالہ تعلیم و تربیت پڑھا۔ مگر ایک افسوس ناک خبر یہ کہ تعلیم و تربیت کا تازہ شمارہ سفر میں ہم سے گم ہوگیا۔ اب مجھے نیند آ رہی تھی۔ "کیا ہے ماما؟ مجھے سونے دیں"۔ ہم نے سوتے میں کہا۔ یہ سن کر ماما نے کہا "کیا واپس لاہور جانے کا ارادہ ہے؟"

"کیا؟ کراچی آگیا ہے" میں یہ کہتے ہوئے جلدی سے اٹھی اور اپنا ہینڈ بیگ لے کر نیچے اتری۔ نیچے اترے تو بارش نے استقبال کیا۔ ارے نہیں نہیں استقبال کے لیے صرف بارش ہی نہیں، دوسرے لوگ بھی آئے تھے۔

ویسے تو کراچی میں ہمارے چند رشتہ دار بھی رہتے ہیں مگر ہم اپنے رشتہ داروں کے پاس نہ گئے۔ بلکہ لڑکے والوں نے ہم سب کے لیے ایک فلیٹ لیا ہوا تھا اس لیے ادھر کا رخ کیا۔ فلیٹ کا نام پڑھا تو پتا چلا کہ یہ کہکشاں اپارٹ منٹ ہیں۔ فلیٹ کیا تھا سوائے قالین کے اور چند ایک تکیوں اور چادروں کے وہاں کچھ نہ تھا۔ فلیٹ کا جائزہ لینے کے بعد ہم سو گئے۔ اٹھے تو دلہا والوں کی طرف سے کھانا آیا ہوا تھا۔ سندھی بریانی بھیجی تھی۔ واہ کتنے مزے کی تھی۔ پھر فلیٹ میں گھومے پھرے۔ اس کے بعد فلیٹ سے باہر آ گئے اور کھیلنے لگے۔ آخر ہم لاہوری بچے تھے، شرارتیں کیے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟ خیر اب ولیمے کی تیاری کرنی تھی۔ کوئی اپنی نیل پالش ڈھونڈ رہا تھا تو کوئی برش۔ خیر کچھ دیر بعد سب تیار ہو چکے تھے۔ پھر ہم ولیمے پر چلے گئے۔ وہاں مووی وغیرہ بنوائی، خوب انجوائے کیا اور واپس آ گئے۔

واپس آئے تو پورا فلیٹ پانی سے بھر چکا تھا۔ جانے کس نے شرارت کی تھی۔ فلیٹ کا نل ہماری عدم موجودگی میں کھلا رہا تھا۔ اس لیے ہمیں بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ شام کو ہم سیر کے لیے سندباد پلے لینڈ گئے۔ سندباد بہت خوب صورت پلے لینڈ ہے۔ یہاں ہر طرف جھولے ہی جھولے ہیں۔ یہ ساحلی پٹی کے بالکل ساتھ ہے۔ یہاں سے ہم الہ دین پلے لینڈ گئے۔ یہ بھی بہت ہی خوب صورت پلے لینڈ ہے۔ یہ اصل میں ایک واٹر پارک ہے۔ یہاں پر تیراکی کے لیے کئی تالاب موجود ہیں۔ یہاں مصنوعی سمندر بنایا گیا ہے جس پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ اور یہاں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بھی بنائی گئی ہیں۔ اگلی صبح ہم نے کلفٹن جانے کا پروگرام بنایا اور یوں اگلے دن ہم ساحل پر کھیل رہے تھے۔ کوئی گھروندے بنا رہا تھا تو کوئی جھولے جھول رہا تھا اور کوئی اونٹ کی سواری کر رہا تھا۔ ہم بھی اونٹ پر بیٹھے لیکن جب اونٹ کھڑا ہوا تو ہماری چیخیں نکل گئیں۔

کل ہماری واپسی تھی۔ کراچی کا نیا ائیر پورٹ بنا ہے۔ جو بہت خوب صورت ہے اور یہاں سے پوری دنیا کو پروازیں جاتی ہیں۔ یہاں سے ہم جہاز پر سوار ہو گئے اور کچھ ہی دیر بعد لاہور میں اپنے گھر میں موجود تھے (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

آیئے دوست بنائیں

سلطان محمود 15 سال
کہانیاں لکھنا
ڈاکچیاں تحصیل سرائے عالم گیر
ضلع جہلم

زاہد انور 15 سال
کرکٹ
پلاٹ نمبر 11۔ ایس۔ سی
ابراہیم ولا زفیز 1 ملیر۔ کراچی

کاشف جاوید 12 سال
کرکٹ
آر بلاک 479 بی ایکس وی
اٹک (شہر)

محمد ہاشم پال 11 سال
بائی سکل چلانا
14 گل افشاں کالونی جہلم
چھاؤنی

محمد بشیر رانجھا 14 سال
گلوکاری
مکان نمبر 1437 محلہ درکھانہ
والا گلی امام دین قدیر آباد ملتان

مرتضیٰ ظہیر 12 سال
فٹ بال کھیلنا
452 اے تھری گلبرک
تھری لاہور

اویس کبیر 8 سال
فٹ بال کھیلنا
پوسٹ بکس نمبر 9650
دوحہ قطر

سلمان رشید سنی 14 سال
کرکٹ
381\ دائی۔ اقبال کالونی
سرگودھا

اسد اللہ مسعود 5 سال
کھیلنا کودنا
مکان نمبر 312\8 محلہ کریم
پورہ۔ لالہ موسیٰ

محمد علی حسن 4 سال
بائی سکل چلانا
گرین وڈ اسٹریٹ
سیال کوٹ

ملک خرم شہزاد اعوان 15 سال
ہاکی کھیلنا
مکان نمبر 62 گلی نمبر 1 سلیم
پارک سرگودھا

محمد معین ظفر 14 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
177 الیف بلاک
عارف والا

محمد زمان ظہیر مغل 15 سال
فٹ بال کھیلنا
مستری بلال، مکان نمبر 1816
البدر اسٹریٹ گلگھڑ منڈی

محمد عدیل 13 سال
کرکٹ
مکان نمبر 443 پی محلہ فیض
آباد ساہی وال۔

محمد عارف 11 سال
کرکٹ
62۔ اے پیپلز کالونی نمبر 1
فیصل آباد

راجا وسیم حسن 14 سال
کرکٹ
جمعہ محلہ گلی نمبر 1 منڈی
بہاء الدین

سید یاسر علی گیلانی 15 سال
فٹ بال
باٹا کالونی نمبر 3 بلاک نمبر 49
ڈی۔ باٹا پور لاہور

محمد عبدالرحیم 15 سال
مطالعہ
مکان نمبر 340 گلی نمبر 4 فراز
کالونی فیصل آباد

مقتدر شعیب قاضی 8 سال
کہانیاں پڑھنا
زنانہ ہسپتال
بنوں

خاور سعید 14 سال
مطالعہ
چک نمبر 207 گجر خانوالہ
منصور آباد فیصل آباد

آیئے دوست بنائیں

کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں)

نام ..... عمر .....

مشاغل .....

پتا .....

دوزخ سے فرار

سلیم خان گی

سفیدار، شہتوت اور شیشم کے درختوں میں چھپے ہوئے چھوٹے سے باورچی خانے کے کواڑ کے پیچھے کھڑے کریم جو اور سکینہ انڈین آرمی کو دیکھ رہے تھے۔ پولیس والے اور ان کا انچارج تھانیدار چار گھوڑوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چابک تھے جن سے وہ انسانوں اور حیوانوں کو مار پیٹ رہے تھے۔ فوج کی نفری مقبوضہ ریاست جموں و کشمیر کے ضلع ڈوڈہ کے ایک گاؤں موہن پورہ میں اکٹھی ہو گئی تھی تاکہ وہاں سے صحت مند مسلمانوں کو قید کر کے لے جائے اور دریائے توی پر پل تعمیر کرنے کے لیے ان سے بیگار لے۔ جو جانے سے انکار کرتا یا پس و پیش سے کام لیتا اسے گولی مار دی جاتی اور لاش کھائی سے نیچے لڑھکا دی جاتی۔ چنانچہ اب مسلمان نوجوان ہتھیار بند ہو کر مقابلہ پر اتر آئے تھے۔

کریم جو اور سکینہ کی ماں تو پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ اس بار انڈین آرمی کے سپاہی موضع موہن پورہ آئے تو وہ ان کے والد اور بھائی کو پکڑ کر لے گئے۔ والد کی عمر 45 سال تھی اور بھائی کی عمر 20 سال، سکینہ کی عمر تیرہ سال تھی اور کریم جو کی عمر بارہ سال۔ وہ تین بچوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ جس گھر میں رہتے تھے اس کے دو کمرے اور ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا جس کے اردگرد سفیدار، شہتوت اور شیشم کے درختوں کا جھنڈ گچھے کی طرح اسے لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ اگر وہ دونوں سامنے آجاتے تو فوج ان کو بھی یقیناً پکڑ کر لے جاتی اور بیچ دیتی۔

جیپوں میں بیٹھے ہوئے فوجی اور گھوڑوں پر سوار پولیس والے موہن پورہ کے پندرہ مسلمانوں کو بیگار میں پکڑ کر لے گئے تو گاؤں کے ہندو مرد عورتیں، لڑکے لڑکیاں اور بچے جموں کو جانے والے راستے سے پلٹ کر واپس اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ ان کے چہروں پر نہ خوشی تھی نہ غمی۔ حیرت کا جذبہ بھی نہ تھا۔ غصے اور شرمندگی کا احساس بھی ناپید تھا۔ وہ ایک مدت سے یہی کچھ ہوتا دیکھتے چلے آئے تھے۔

"سکینہ بیٹی، سکینہ بیٹی" سکینہ کو کوئی شخص دھیمی آواز میں پکار رہا تھا۔ سکینہ نے مڑ کر دیکھا۔ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر کوتاہ قد شہتوت کے پتوں میں سے بابا رمضان کا بوڑھا ہاتھ دکھائی دیا۔ اس کے بعد اس کا چہرہ نظر آیا جو ہڈیوں کا مجموعہ تھا۔ ڈاڑھی سفید براق تھی۔

"بیٹی سکینہ، میں ہوں رمضانو بابا" وہی آواز آئی۔

"ہاں بابا۔ میں نے پہچان لیا۔ ادھر آجاؤ دیوار کے ساتھ" سکینہ بولی۔

بابا رمضانو چھڑی ٹیکتا ہوا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے باورچی خانے میں آکر ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"تم دونوں نے وہ آواز سنی تھی جو آپ کے بابا نے فوجیوں کے ساتھ جاتے ہوئے بلند کی تھی؟" بابا رمضانو نے سکینہ سے پوچھا۔

"ہاں سنی تھی۔ بابا کہہ رہا تھا جنت میں ملیں گے" سکینہ

بولی۔

"یہ فقرہ میں نے بھی سنا تھا لیکن مجھے بالکل تو سمجھ نہ آئی"۔ کریم جو نے کہا۔

"جنت سکھ کی جگہ ہے اور دوزخ دکھ کی جگہ" رمضانو بولا

"ہاں یہ تو بالکل درست ہے" سکینہ نے کہا۔

"آپ کے بابا نے یہ جو کہا کہ جنت میں ملیں گے اس کا مطلب تھا ہم اب سکھ کی جگہ ملیں گے اور وہ سکھ کی جگہ پاکستان ہے۔ یہ جو موہن پورہ ہے یا ڈوڈہ کا ضلع ہے یا جموں کا صوبہ ہے یہ تو بھارتی فوج اور ڈوگرہ راج کی وجہ سے دوزخ بن چکا ہے"۔

"یہ بات تو ٹھیک ہے رمضانو بابا۔ آج وہ ہمارے باپ اور بھائی کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ دو چار سال میں ہم بڑے ہوں گے تو ہمیں پکڑ کر لے جائیں گے" کریم جو بولا۔

"اس وقت بھی تو بری حالت ہے ہماری۔ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے ہم سے" سکینہ روہانسی آواز میں بولی۔

"ایک اور بات کہی تھی تمہارے بابا نے' اس نے کہا تھا قطبی تارے کا سہارا لینا" بابا رمضانو نے بتایا۔

"مجھے ابا کی اس بات کی بھی سمجھ نہیں آئی۔ ویسے میں نے قطبی تارے کے لفظ تو سنے تھے" کریم جو نے کہا۔

"قطبی تارا آسمان پر ہوتا ہے۔ رات کو نظر آتا ہے۔ رات کو سفر کرنے والے لوگ اس کو نظر میں رکھ کر سفر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ راستہ نہیں بھولتے۔ آپ کے والد نے کہا تھا رات کو سفر کرو تو قطبی تارے پر نظر رکھ کر سفر کرو تاکہ سیدھے پاکستان کی طرف جانے والے راستے پر چلتے رہو اور پھر پاکستان پہنچ جاؤ" بابا رمضانو نے وضاحت کی۔

"کون سی منزل؟" سکینہ نے پوچھا۔

"وہی جنت میں ملیں گے" بابا رمضانو بولا۔

"بس بس میں سمجھ گیا ساری بات۔ بابا نے کہا کہ جنت یعنی پاکستان میں ملیں گے۔ تم دونوں رات کو سفر کرو اور قطبی تارے کی مدد لو۔ بات صاف ہو گئی" کریم جو جوش سے بولا۔

"یعنی ہمیں موہن پورہ چھوڑ کر پاکستان جانا ہو گا اور سفر رات کو کرنا ہو گا۔ ہے نا بابا؟ سکینہ نے کہا۔

"ہاں بیٹی یہی مطلب تھا آپ کے والد کا۔ اس نے کل مجھ سے کہا تھا کہ اگر اسے انڈین آرمی پکڑ کر بیگار میں لے جائے تو میرے بچوں سے کہنا وہ پاکستان چلے جائیں جو ان کے لیے جنت سے کسی طور پر کم نہیں"۔

"بابا نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ جگہ مسلمانوں کے لیے دوزخ بن چکی ہے اور پاکستان ہمارے لیے واقعی جنت ہے" کریم جو بولا۔

بابا رمضانو نے جنوب کی طرف منہ کر کے انگلی سے اشارہ کیا اور بولا "اس طرف ہے پاکستان' میری انگلی کی سیدھ چلے جانا۔ راستے میں جنگل' دلدل' ندی نالے اور پہاڑیاں آئیں گی لیکن گھبرانا نہیں۔ سفر رات کو کرنا۔ میں آج آپ کو شام تک دیا سلائی' چاقو اور کچھ بھارتی روپے لا دوں گا جو کام آئیں گے" بابا رمضانو بولا۔

"آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے بابا؟" سکینہ نے پوچھا

"نہیں بیٹی' میں بہت بوڑھا ہوں۔ میں اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتا۔ ہاں یاد آیا اگر راستے میں کوئی ہندو نام پوچھے تو اپنا نام کستوری لال اور تو رام پجارن بتانا۔ اگر اصل نام کریم جو اور سکینہ بتائے تو تمہارا بچنا محال ہے"۔

بابا رمضانو یہ کہہ کر چھڑی ٹیکتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا جو کریم جو اور سکینہ کے گھر سے دس مکان چھوڑ کر تھا۔ انڈین آرمی بابا رمضانو کے بھی دو بیٹے لے گئی تھی۔ جب وہ شام کو واپس آیا تو کھدر کا رومال اس کے پاس تھا جس میں پراٹھے اور اچار تھا۔ دو چاقو تھے اور اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی دیا سلائی کی دو ڈبیاں تھیں' ایک کریم جو کے لیے اور ایک سکینہ بی بی کے لیے۔ اس نے ان کو پچاس روپے (انڈین کرنسی) بھی دیئے۔

جب موہن پورہ کے لوگ سو گئے اور قطبی تارا آسمان پر چمکنے لگا تو کریم جو اور سکینہ اللہ کا نام لے کر موہن پورہ کی اس ڈنڈی کی طرف ہو لیے جو جوار اور باجرا کے کھیتوں میں سے جنوب کی طرف جاتی تھی۔ چلتے چلتے سکینہ نے سوچا یہ ڈنڈی ان کو جنت میں لے جائے گی جہاں دکھ نہیں سکھ ہے۔ دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ امن اور سکون ہے۔ رات کو فوجی پکڑ

دھکڑ کے لیے چھاپے نہیں مارتے۔ کسی کو حقارت سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہر ایک کے لیے انصاف کے دروازے کھلے ہیں۔

جوار مکئی اور باجرے کے کھیت ختم ہو گئے تھے اور اب سامنے دلدل تھی۔ ندی نالوں کا پانی اکٹھا ہو گیا تھا۔ دلدل کے کنارے کھڑے ہو کر کریم جو کچھ سوچنے لگا۔ پھر جی کڑا کر کے جوتے اتارے اور دلدل میں اتر گیا۔ سکینہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ کیچڑ اور گارا پہلے ٹخنوں تک تھا پھر اس سے بھی اوپر آگیا لیکن وہ جی کڑا کر کے آہستہ آہستہ پیر اٹھاتے چلتے رہے۔ دلدل ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ کبھی کبھی کنول کے پودے اور پھول پیروں اور پنڈلیوں سے الجھ جاتے تو لگتا آبی سانپ پیروں' پنڈلیوں' ٹخنوں اور گھٹنوں سے لپٹ گئے ہیں اور ڈنک مارنے والے ہیں۔ ان کا سانس پھولا ہوا تھا اور زبانیں خشک تھیں۔

دلدل پار کرنے میں ان کو بہت وقت لگا۔ کم و بیش دو گھنٹے' جب وہ دلدل پار کر رہے تھے تو ان کے گاؤں کی طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"بھائی کریم جو' کتے کہاں بھونک رہے ہیں"؟

"کتوں کے بھونکنے کی آوازیں تو ان جوار مکئی اور باجرہ کے کھیتوں سے آرہی ہیں جن میں سے ہو کر ہم یہاں آگئے ہیں' دلدل پار کر کے جنگل کے کنارے"

"وہ دلدل پار کریں گے؟"

"نہیں' کیوں کہ پانی میں سے یا پانی کے اوپر سے ہمارے جسموں کی خوشبو سفر نہیں کرتی۔ اب سنو! آرہی ہے کسی کتے کی آواز؟"

"نہیں"

"وہ واپس چلے گئے ہیں موہن پورہ کی طرف۔ انہوں نے تمام کھیت دیکھے لیکن ان کو کچھ نہ ملا۔ ہم عین وقت پر دلدل پار کر گئے"۔

"میرا تو تھکان سے جسم ٹوٹ رہا ہے" سکینہ نے کہا۔

"میرا بھی یہی حال ہے۔ جنگل میں کچھ دور جا کر کسی مناسب جگہ سو جاتے ہیں کیا خیال ہے؟" کریم جو نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے" سکینہ نے کہا اور وہ دونوں جوتے پہن کر جنگل کے اندر گھس گئے۔ ایک گھنٹا سفر کرنے کے بعد ان کو بڑ کا ایک بہت پرانا درخت ملا جو گرا ہوا تھا اور سوکھ گیا تھا۔ اس کی جڑوں سے کونپلیں اور پتے نکلے ہوئے تھے۔ انہوں نے کونپلیں اور پتے دیکھ بھال کر سونے کے لیے جگہ بنائی اور کمبل بچھا کر کونپلوں اور پتوں کی اوٹ میں لیٹ گئے۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی' لیٹتے ہی سو گئے۔

وہ تھکے ماندے اور سہمے ہوئے تھے۔ بڑ کے درخت کی جڑوں میں نئی کھلی کونپلوں اور ہرے ہرے پتوں کی اوٹ میں ایسے سوئے کہ جب اٹھے تو شام ہو چلی تھی۔

"بھائی ہم تو بہت سوئے" سکینہ نے کہا۔

"تھکے ہوئے تھے نا اس لیے اور پھر جگہ بھی پر سکون تھی" کریم جو بولا۔

"بھوک لگی ہے تو پراٹھا کھا لو۔ اچار کے ساتھ" سکینہ بولی۔

"پانی تو ہو گا نہیں۔ پراٹھا اور اچار حلق کے نیچے کیسے ہو گا؟" کریم جو نے کہا۔

"تو چلو پھر پہلے پانی تلاش کرتے ہیں مل گیا تو کھالیں گے" سکینہ نے کہا۔

وہ دونوں ناک کی سیدھ جنگل میں چلتے رہے۔ جب شام رات میں تبدیل ہوئی تو جنگل بھی ختم ہو گیا۔ وہ دونوں ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں درخت کاٹنے والے ٹھیکے داروں کا اڈہ تھا۔ سبھی لوگ تو جا چکے تھے۔ وہاں بس ایک چوکی دار تھا جو چولہے پر کیتلی رکھ کر چائے گرم کر رہا تھا۔ جب اس نے ان کو دیکھا تو ہڑبڑا کر بولا "تم کون ہو؟"

"ہم دونوں بہن بھائی ہیں' مسافر ہیں اور راستہ بھول گئے ہیں۔ یہاں روشنی دیکھی تو آپ کے پاس آگئے۔ ہمیں پانی چاہیے صبح سے بھوکے ہیں" کریم جو بولا۔

"آپ چارپائی پر بیٹھ جائیں میں پانی دیتا ہوں"

چوکیدار نے بڑے سے مٹی کے پیالے میں پانی بھر کر ان کے پاس رکھ دیا اور وہ دونوں پراٹھے اور اچار سے بھوک مٹانے لگے۔ اطمینان سے کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھے اور چلنے لگے۔

"آپ نے اپنا نام تو بتایا نہیں" چوکی دار بولا۔

میرا نام کستوری لال ہے اور یہ میری بہن رام پجارن ہے" کریم جو نے کہا اور چوکی دار سے پوچھا۔ "گاؤں کتنی دور ہے؟"

"یہ سامنے سیدھا راستہ جاتا ہے گاؤں کو"

اگر وہ کھڑے رہتے تو چوکی دار مزید پوچھتا لیکن کریم جو چل پڑا اور اس کے پیچھے پیچھے سکینہ بی بی بھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بوندا باندی کا امکان تھا۔ کوئی تارا یا قطبی تارا نظر نہ آرہا تھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ اس گاؤں کے سامنے آگئے جو جنگل کے کنارے تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ گھروں میں دیئے جل رہے تھے لیکن ان کی روشنی بہت کمزور تھی۔ گاؤں سے رگڑ کھا کر آگے بڑھتی ہوئی سڑک پر وہ چلتے رہے۔ یہ سڑک پہاڑ کی طرف جاتی تھی اور وہ تازہ دم تھے۔ چنانچہ وہ گاؤں سے ہٹ کر سڑک کے بائیں کنارے کے ساتھ کچی سڑک پر سفر کرتے رہے۔ آدھی رات کو ان کو محسوس ہوا کہ وہ پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔

"کریم بھائی ہم پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں" سکینہ بولی۔

کریم جو آگے تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے تو محسوس نہ ہوا کہ ہم پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں" وہ بولا۔

"میرا تو برا حال ہے تھکاوٹ سے پیر اٹھانا دوبھر ہو گیا ہے" سکینہ بولی۔

"چڑھائی ہے اس لیے تھکاوٹ زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میرا اپنا برا حال ہے۔ جی چاہتا ہے پیروں پر گر کر لیٹ جاؤں لیکن ایسا ہو نہیں سکتا"

"میں تو سوچتی ہوں ہمیں ساری عمر سفر کرتے رہنا ہے۔ یہ راستہ اوپر جا رہا ہے، آسمان کی طرف۔ پتا نہیں کب نیچے اترے گا"

"مایوس نہ ہوں۔ اللہ کا نام لے کر پیر اٹھاؤ، اسے زمین پر رکھو پھر دوسرا اٹھاؤ اور زمین پر رکھو۔ ایک ایک قدم سے میلوں کا سفر طے ہو جائے گا"۔

بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ دونوں پھر روانہ ہوئے۔ ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے۔ جب نور کا تڑکا ہوا تو وہ بری طرح بھیگ چکے تھے۔ ان کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ سکینہ کو بخار تھا اور کریم جو اسے سہارا دے کر چل رہا تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ ڈھلوان شروع ہو گئی تھی اور جہاں سے ڈھلوان شروع ہوئی تھی وہاں مسافروں کا پڑاؤ تھا جو خالی تھا وہاں پڑاؤ سے ذرا ہٹ کر وہاں مندر بھی تھا۔ وہ دونوں مندر میں گئے جو بہت چھوٹا تھا اور بالکل خالی تھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ مندر میں کوئی مسافر کسی وقت آسکتا تھا۔ مسافر نہ سہی مندر کا پروہت آجاتا۔ سکینہ کو مندر میں بٹھا کر کریم جو نے ساتھ والی پہاڑی میں غار ڈھونڈا اور سکینہ کو سہارا دے کر وہاں سے لے گیا۔ اس کی چادر اتار کر اسے کمبل دیا اور خشک پتے اور ٹہنیاں ادھر ادھر سے چن چن کر آگ جلائی۔ سکینہ جلدی سے لیٹ گئی اور وہ بھی پتھر کا سہارا لے کر لیٹ گیا لیکن اسے نیند نہ آئی۔ اسے رہ رہ کر سکینہ کا خیال آرہا تھا۔ اس نے مندر میں لکڑیوں کا گٹھا دیکھا تھا جو شاید پروہت یا پجاری نے اپنے لیے آگ جلانے کے لیے رکھا تھا۔ چنانچہ وہ مندر میں

گیا اور لکڑیوں کا گٹھا اٹھا لایا۔ اسے جلایا تو غار گرم ہو گیا۔ اس نے سکینہ کی چادر اور اپنا کمبل بھی خشک کیا۔ بارش کا پانی اکٹھا کر کے بہن کے منہ میں ڈالا اور اس کا سر دبایا۔ سکینہ کا بخار کم ہوا اور وہ سو گئی۔ کریم جو پر سکون ہو کر لیٹ گیا اور پھر گہری نیند سو گیا۔

جب دونوں بہن بھائی شام کو اٹھے تو سکینہ کا بخار اتر چکا تھا۔ بارش تھم گئی تھی۔ گیلے کپڑے خشک ہو چکے تھے اور پڑاؤ کی طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ کریم جو نے جا کر خاموشی سے پتا کیا۔ بکروالوں کا قافلہ اترا تھا۔ وہ آج رات اپنی بھیڑوں بکریوں اور کتے بلیوں کے ساتھ مندر کے پاس پڑاؤ کریں گے اور کل صبح کٹھوعہ کی طرف روانہ ہوں گے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ساتھ والے گاؤں میں فوجی افسروں نے ان کی پوچھ گچھ کی تھی اور پوچھا تھا کہ انہوں نے 16 سال کا لڑکا اور 14 سال کی لڑکی تو نہیں دیکھی۔ دونوں مسلمان ہیں اور پاکستان کے جاسوس ہیں۔ ان کو زندہ یا مردہ پکڑنا ضروری ہے۔ بکروالوں نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔

کریم جو نے ایک بکروال سے دودھ اور مکھن خریدا دو چپاتیاں لیں اور غار میں آ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں بہن بھائی پھر رات کے سفر پر روانہ ہوئے۔ قطبی تارا ان کا راہنما تھا۔ کیوں کہ اب آسمان صاف تھا اور بادلوں کا دور دور تک نشان نہ تھا۔

وہ اب جس علاقے میں سے گزر رہے تھے، یہ ملا جلا علاقہ تھا۔ کہیں پہاڑی آ جاتی کہیں جنگل آ جاتا۔ یہ سانپوں اور نیولوں کا علاقہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے ندی نالے بھی عام تھے۔

جب صبح ہوئی تو وہ ابھی تک جنگل میں تھے۔ راستہ جسے وہ سڑک کہتے تھے ختم ہو چکا تھا۔ چاروں طرف کیکروں، توتوں، بکائین اور شیشم کا جنگل تھا اور اس جنگل میں ایک تھڑے پر جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ جھونپڑی کے ساتھ ایک چشمہ بہ رہا تھا جو پہاڑی سے پھوٹتا تھا اور ندی میں گرتا تھا۔ وہ جھونپڑی سے کچھ دور کھڑے کان لگا کر سنتے رہے لیکن کوئی آواز نہ آئی۔ وہ تھکاوٹ اور بھوک پیاس سے چور تھے۔ خدا کے بھروسے پر جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔

جھونپڑی خالی تھی۔ وہاں نہ آدم تھا نہ آدم زاد۔ لگتا تھا چپ کی حکومت ہے۔

سکینہ نے برتن ٹٹولے۔ ایک میں دال تھی اور دوسرے میں چاول "بھائی، دال چاول مل گئے" سکینہ بولی۔ اس کے لہجے میں بے انتہا خوشی تھی۔

"واہ مزہ ہو گیا۔ دیا سلائی ہمارے پاس ہے۔ یہ رہا تیل کا چولہا، چڑھا دیں اس پر کھچڑی"

کریم جو نے چولہا جلا دیا۔

"میں اب جاتا ہوں ندی پر، شاید مچھلی ہاتھ آ جائے" کریم جو نے کہا۔

"نہ نہ نہ آپ نہ جائیں، دشمن کا کوئی پتا نہیں" سکینہ گھبرا کر بولی۔

"یہاں دشمن کہاں؟ یہ تو اجاڑ بیابان ہے" کریم جو نے کہا۔

"اجاڑ بیابان تو نہیں۔ البتہ جنگل کہہ سکتے ہیں۔ یہ جھونپڑی کسی شکاری کی ہو گی۔ بہت صاف ستھری ہے" سکینہ بولی۔

"اللہ جانتا ہے یہ کس کی جھونپڑی ہے۔ میں جاتا ہوں۔ جلدی آ جاؤں گا"

اور وہ ندی کی طرف چل دیا۔ جب وہ خالی ہاتھ واپس آیا تو کھچڑی پک چکی تھی۔ جھونپڑی ہی میں سے لی ہوئی تام چینی کی پلیٹوں میں کھچڑی ڈال کر انہوں نے پیٹ بھر کر کھائی اور پھر وہ دن بھر سونے کا پروگرام بنانے لگے۔

"بھائی، میرا جی چاہتا ہے میں اس جھونپڑی میں سو جاؤں، اس چارپائی پر" سکینہ بولی۔

"جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے لیکن اگر کوئی آ گیا تو ہم دوزخ میں رہیں گے جنت میں نہ جا سکیں گے" کریم جو بولا۔

"میں پتھروں روڑوں اور ٹھیکریوں والی گیلی زمین پر سوئی تو پھر بیمار ہو جاؤں گی" سکینہ نے کہا۔

"یہ بات تو ٹھیک ہے آپ کی۔ پھر؟" کریم جو نے کہا۔

"پھر یہ کہ میں جھونپڑی میں سو جاتی ہوں آپ چھپ کر اوٹ میں سو جائیں" وہ بولی۔

"اگر کوئی آیا تو مجھے کیسے پتا چلے گا؟"

"میں چیخ ماروں گی"

"ٹھیک ہے۔ میں چھپ کر سوتا ہوں"

کریم جو نے کمبل لیا اور جھونپڑی کے پیچھے کیلوں کے پودوں کی اوٹ میں سو گیا۔ جب دن ڈھلا تو اس نے سکینہ کی چیخ سنی۔ وہ اٹھا۔ اس نے چاقو کا پھل کھولا اور تیزی سے جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے دیکھا چالیس سال کا خونخوار آنکھوں والا شخص رومال سے سکینہ کا منہ بند کر چکا ہے اور رسے سے اس کے دونوں ہاتھ چارپائی سے باندھ رہا ہے۔ بندوق دیوار کے ساتھ کھڑی ہے۔ اس نے بندوق اٹھائی اور نالی سے پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے اس کے سر پر جمائی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا تو کریم جو نے بندوق ٹھیک طرح سے پکڑ کر نال اس ہندو کی طرف کی اور گھوڑا دبا دیا۔ دھماکا ہوا اور گولی اس کی کھوپڑی کے پار ہو گئی۔ کریم جو نے سکینہ کو آزاد کیا اور جنگل میں بھاگنے لگے۔ جب وہ دو میل دور نکل گئے تو سکینہ نے کہا۔ "بھائی آپ ٹھیک کہتے تھے کہ جھونپڑی میں نہیں سونا چاہیے!"

"کون تھا وہ؟"

"وہ ہندو تھا۔ جھونپڑی کا مالک۔ بھائی کریم جو آپ نے تو کمال کر دیا"

"بس اللہ تعالیٰ نے مجھے حوصلہ دیا۔ ورنہ میرا اور اس کا کیا مقابلہ؟"

جنگل ختم ہوا۔ پہاڑی آئی۔ وہ پار کی تو ندی آئی۔ ندی عبور کی تو رات آ گئی۔ اب دونوں میں پیر اٹھانے کی سکت نہ رہی تھی۔ پیر زخمی ہو گئے تھے اور ان میں سے خون رس رہا تھا۔

جب وہ رات کو مجبور ہو کر اگلے گاؤں جس کا نام سندر پور تھا مرہم پٹی کے لیے کسی حکیم، جراح یا نائی کی تلاش میں پہنچے تو گاؤں میں ہر طرف چراغ جل رہے تھے جو گھروں کی دیواروں پر رکھے گئے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ رات مایا دیوی کے درشن کی رات ہے۔ یعنی اس خاص رات مایا دیوی کسی نہ کسی کو درشن دے کر اسے کروڑ پتی کر دیتی ہے۔ اس کے درشن کے لیے اردگرد کے دیہات کے سیدھے سادے لوگ اکٹھے ہوئے اور کھانا (بھوجن) پکا کر خود بھی کھا رہے تھے اور مایا دیوی کو خوش کرنے کے لیے دوسرے لوگوں کو تقاضا کر کے کھلوا رہے تھے۔

کریم جو اور سکینہ کو جراح تو ملا نہیں البتہ ایک باتونی نائی مل گیا۔ اس نے بہن بھائی کے زخمی پیر دیکھ کر کہا

"معلوم ہوتا ہے مایا دیوی کے درشن کے لیے بہت دور سے آئے ہو"۔

کریم جو نے کوئی جواب نہ دیا۔ دس روپے کا نوٹ اس کی تلی پر رکھا اور دونوں پیر آگے کر دیئے۔ نائی نے گرم پانی سے پیر دھوئے پھر کالے رنگ کا تیل لگایا۔ دوائی کا لیپ کیا اور اس کے بعد سفید ململ سے پیر باندھ دیئے۔ "دو دن میں آرام آجائے گا" وہ بولا۔

اس کے بعد یہی عمل اس نے سکینہ کے پیروں پر دہرایا۔

نائی سے فارغ ہو کر وہ گاؤں کی گلی میں آئے۔ ہر طرف چراغ جل رہے تھے۔ دور و نزدیک سے آئے ہوئے لوگ مایا دیوی کو دیکھنے کے لیے پاگلوں کی طرح گھوم رہے تھے۔

کریم جو نے پندرہ روپے پر ٹٹو کرائے پر لیا۔ خود اس پر بیٹھا اور اپنے پیچھے سکینہ کو بٹھایا اور وہ دونوں جنوب کی طرف قطبی تارے کے نشان پر پاکستان کی طرف چل پڑے۔

اذان کے وقت وہ ٹٹو والے کے گاؤں جو گندر پور پہنچے اور ٹٹو سے اتر کر کچھ دیر سڑک پر کھڑے رہے اور جب ٹٹو والا چلا گیا تو وہ قطبی تارے کو دیکھ کر فصلوں میں گھس گئے۔ وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر چلتے رہے اور جب صبح ہوئی تو وہ ایک کسان کے ڈیرے پر تھے۔ ڈیرے کے چاروں طرف فصلیں تھیں۔ ایک صحت مند نوجوان لڑکی دہی بلو رہی تھی اور ایک صحت مند بچہ چارپائی پر لیٹا سو رہا تھا۔ گھر کے دو کمرے الگ تھے اور حویلی میں ایک گھوڑی، ایک بھینس اور ایک ٹریکٹر کھڑا تھا۔ وہ درخت کی اوٹ سے چاٹی سے مکھن نکالنے والی صحت مند ماں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ ان کے پیچھے سے آواز آئی "آؤ پیارے بچو، کھڑے کیوں ہو۔ آجاؤ"۔

وہ دونوں آنے والے شخص کے ساتھ چل پڑے۔ وہ سکھ تھا اور اس کا نام دھیان سنگھ تھا۔

عورت نے اٹھ کر ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار کیا۔ پھر لسی میں شکر ڈالی اور ان کو گلاس تھما دیئے۔ گلاس میں مکھن بھی تھا آدھ آدھ پاؤ ہو گا۔ "مکھن کھاؤ اور جان بناؤ" پریتم کور نے کہا اور پھر سفید پٹیوں میں ان کے بندھے ہوئے زخمی پیر دیکھ کر بولی "ہائے میں مرگئی آپ دونوں زخمی ہیں، کسی حادثے سے بچے ہیں آپ کیا؟"

"کیا نام ہے تمہارا کاکا؟" دھیان سنگھ نے کریم جو سے پوچھا۔

"اور بی بی کا کیا نام ہے؟" پریتم کور نے سوال کیا۔

کریم جو نے درست نام بتا دیئے۔ وہ دونوں کی محبت اور شفقت کے سامنے جھوٹ نہ بول سکا۔

"ہم 1947 کے پنجاب والے سکھ نہیں ہیں۔ ہم سے گھبرانا نہیں" دھیان سنگھ بولا۔

وہ تین دن اور تین راتیں دھیان سنگھ اور پریتم کور کے مہمان رہے۔ ان تین دنوں کے دوران میں دھیان سنگھ اور پریتم کور نے ایک چھوٹی سی کشتی بنائی اور اس میں ان کو بٹھایا۔ پتوار دیئے اور بیس ندی کی لمبائی چوڑائی اور پانی کی رفتار سے ان کو باخبر کیا اور کہا کہ وہ کشتی کے ذریعے سفر کر کے اپنی جنت میں چلے جائیں۔

"ہم نہیں جائیں گے۔ ہمیں ڈر لگتا ہے۔ انڈین بارڈر سیکورٹی کو پتا چل جائے گا اور وہ ہمیں بھون ڈالیں گے"۔

آخر دھیان سنگھ ان کے ساتھ ہو لیا اور ایک رات وہ بیس ندی کے پانی پر کشتی لے کر اتر گئے اور دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بارڈر پار کر کے چک امرو ریلوے اسٹیشن کے سامنے صبح کی اذان سے پہلے اپنی جنت میں آگئے۔

کریم جو اور سکینہ کشتی سے نکلے۔ ان کے سامنے سکھو چک اور چک امرو کی مسجدوں کے خوبصورت منظر تھے۔ دونوں نے ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ وہ پاکستان کی آزاد فضا میں آگئے ہیں۔ انہیں اپنے بابا کے الفاظ یاد آئے جو رمضانو بابا نے ان تک پہنچائے تھے کہ قطبی تارے کا سہارا لے کر سفر کرو جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ انہوں نے صبح کی خوشگوار اور خوشبو دار ہوا میں محسوس کیا کہ وہ واقعی جنت میں پہنچ گئے ہیں جسے پاکستان کہا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

بلاعنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 نومبر 1998ء

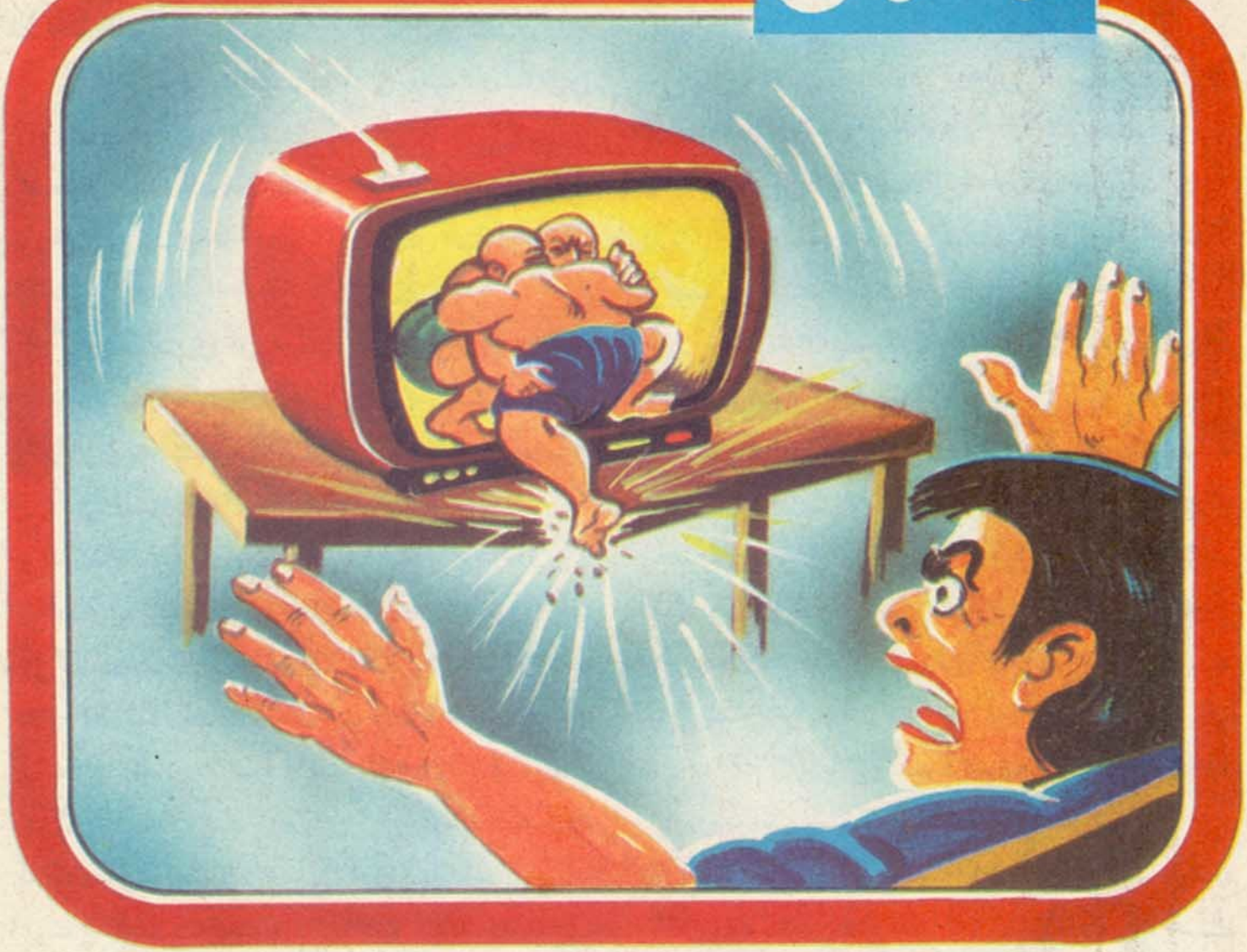

اکتوبر 1998ء کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل چھ عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ چھ ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

- جہاں زیب جہلم چھاؤنی (ابو کا آرام 'اپنا بن گیا کام۔ پہلا انعام:۔100 روپے کی کتابیں)
- عمران اسلم میوا ایبٹ آباد (بھئی یہ کیا؟ دھماکہ وہاں 'چڑچڑ یہاں۔ دوسرا انعام:95 روپے کی کتابیں'
- شازیہ کنول میرپور خاص (ابو سیاست میں ہم ضیافت میں۔ تیسرا انعام:90 روپے کی کتابیں)
- حنا ناصر اسلام آباد (اخبار کڑاکے دار۔ چوتھا انعام:80 روپے کی کتابیں)
- عزیر عزیز میرپور خاص (ابو کی کرسی واہ بھئی واہ۔ پانچواں انعام:75 روپے کی کتابیں)
- رقیہ رفیق 'خان پور (ایک پنتھ دو کاج۔ چھٹا انعام:60 روپے کی کتابیں)

ہمدردِ ملّت ..... حکیم محمّد سعید

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

"صبح 6:45 بجے کراچی میں تین نامعلوم شرپسندوں کی فائرنگ سے سابق گورنر سندھ ہمدرد فاؤنڈیشن کے سربراہ حکیم محمد سعید ہلاک"

17 اکتوبر کو شائع ہونے والے اخبارات کے ضمیموں میں یہ خبر پڑھ کر دل کو شدید دھچکا لگا۔ وہ جو زندگی بھر امن، اخلاق اور شائستگی کی تعلیم دیتا رہا آج خود دہشت گردی کا نشانہ بن گیا تھا۔ حکیم محمد سعید 9 جنوری 1920ء کو بھارت کے شہر دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک متحرک، فعال اور پرعزم شخصیت تھے۔ آپ کا شمار دور حاضر کے چند بہترین طبیبوں اور ادیبوں میں ہوتا تھا۔ آپ اسلام، پاکستان، علم و ادب اور بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔

حکیم سعید وقت کی بہت قدر کرتے تھے اور ہمیشہ پابندی وقت کا خیال رکھتے تھے۔ کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا آپ کی زندگی کے سنہری اصول تھے۔ آپ نے نہ کبھی چائے پی اور نہ ہی کبھی دوپہر کا کھانا کھایا۔ جس کی وجہ سے آپ ہمیشہ چاق و چوبند رہتے تھے۔ آپ کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ جس شخص کو ایک دفعہ دیکھ لیتے اس کو کبھی نہ بھولتے۔ آپ کو بچوں سے خصوصی دل چسپی تھی۔ وہ ہر وقت بچوں کے درمیان رہنا پسند کرتے تھے اور ان سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں بچوں کے لیے خصوصی تقریب "نونہال اسمبلی" ہر ماہ منعقد کرواتے تھے۔ وہ بچوں کو قوم کا مستقبل گردانتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے "بچے پڑھاؤ، ملت بچاؤ مہم چلائی جائے اور مغرب کا مقابلہ کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دی جائے" انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ بچے میری امیدوں کا مرکز ہیں۔ اگر پاکستان کا صدر میں بن جاؤں تو اڑھائی لاکھ مساجد کو تعلیمی ادارے بنادوں۔ آپ ملک کے تمام بچوں کو اپنی ہی اولاد سمجھتے تھے اور ملک کا مستقبل انہی سے وابستہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے آخری بار جس تقریب میں شرکت کی وہ بچوں کی ہمدرد نونہال اسمبلی تھی۔

حکیم سعید بچپن میں بڑے ہونہار طالب علم تھے۔ انہوں نے صرف 9 سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ آپ مولانا محمد علی جوہر سے بہت متاثر تھے اور بڑے ہو کر صحافی بننا چاہتے تھے۔ آپ کو فن پہلوانی کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق کی تکمیل کے لیے آپ رستم زماں امام بخش کے شاگرد بنے اور دہلی میں استاد امام بخش پہلوان کی زیر نگرانی تربیت حاصل کرتے رہے۔

حکیم سعید کی مادری زبان اردو تھی۔ آپ کی گفت گو نہایت شستہ اور ایک عظیم ثقافت کی آئینہ دار ہوتی تھی۔ آپ انگریزی بھی روانی سے بول سکتے تھے۔ جبکہ عربی، فارسی، پشتو، بنگالی، سندھی اور پنجابی حسب ضرورت بول لیتے تھے۔ آپ نے 36 کتابیں اردو میں اور 27 انگریزی میں تصنیف کیں۔ سائنس، میڈیسن، تاریخ اور اسلام پر ان کے 500 سے زائد پر مغز مقالے شائع ہوئے۔ آپ کی زیر ادارت پانچ رسالے اردو میں اور پانچ انگریزی میں شائع ہوتے تھے۔ حکیم محمد سعید ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے صدر، ہمدرد یونی ورسٹی کے بانی اور چانسلر، ہمدرد لیبارٹری (وقف) پاکستان کے چیرمین، طبیہ کالج کراچی کے پرنسپل، انجمن ترقی لائبریز کراچی کے صدر، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر، انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ کراچی کے صدر اور انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل ایشیا اسٹڈیز کے صدر تھے۔ انہیں 1966ء میں ستارۂ امتیاز ملا۔ 1982ء میں کویت نے اسلامک میڈیسن پرائز دیا۔ بہاول پور کے شہریوں نے صادق دوست ایوارڈ دیا اور 1981ء میں استنبول ٹیکنیکل یونی ورسٹی کی طرف سے سرٹیفکیٹ آف میرٹ دیا گیا۔ انہوں نے ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام کم از کم 21 قومی اور بین الاقوامی سیمینار اور سمپوزیم منعقد کیے۔ اور کم از کم 76 بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ آپ مدینۃ الحکمت کے بانی صدر تھے جو ایک بہت بڑا تعلیمی مرکز ہے۔ جہاں پانچ ہزار بچوں کے لیے پبلک اسکول، دو ہزار بچوں کے لیے یتیم خانہ، دس ہزار طلبہ کے لیے ہمدرد یونی ورسٹی، میڈیکل کمپلیکس، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، انسٹی ٹیوٹ فار پوسٹ گریجوایٹ اسٹڈیز، لائبریری اور سائنس میوزیم شامل ہیں۔ آپ تحریک پاکستان کے پرخلوص حامی رہے اور بڑے خوددار شخص تھے۔ بھارت سے آپ خالی ہاتھ پاکستان آئے تھے مگر یہاں آکر آپ نے پر تکلف غذاؤں اور بے جا عیش و آرام کو ترک کر دیا اور 50 روپے ماہوار کرائے پر ایک کمرا لے کر کراچی کے آرام باغ روڈ پر ہمدرد کا پودا لگا دیا۔ جو آج ایک عظیم ٹرسٹ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

حکیم محمد سعید نے اپنی زندگی میں 30 لاکھ سے زائد مریضوں کا علاج کیا۔ ان کے نسخوں میں جو دوائیں تجویز کی جاتی تھیں ان میں سے بعض بالکل نئی ہوتی تھیں جو ان کی ذاتی دریافت تھیں۔ آپ مریضوں کا چیک اپ بالکل مفت کرتے تھے۔ پاکستان کے ایٹمی قوت بننے کے بعد حکیم سعید نے کہا کہ ہم نے ایٹمی دھماکا کر لیا، ملت کا ہر فرد باکردار اور با اخلاق ہو جائے تو یہ اس سے بڑا دھماکا ہو گا۔

دنیا کے عظیم انسان ہونے کے باوجود ان میں ذرہ برابر بھی غرور نہیں تھا۔ آپ کو سفید رنگ بہت پسند تھا۔ آپ ہر موسم اور ہر ملک میں سفید لباس ہی پہنتے تھے۔ اپنا لباس گھر میں اور سفر میں خود دھوتے تھے۔ آپ نے نہ تو کبھی کسی سے انتقام لیا اور نہ ہی کسی سے نفرت کی۔ آپ نے سینکڑوں غریب اور نادار گھروں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے اور اپنی تمام جائیداد ہمدرد ٹرسٹ کو وقف کر چکے تھے۔ آپ نوجوانوں کو منظم کر کے ایک تعلیمی انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔ مگر شرپسندوں کو ان کا یہ انداز اچھا نہ لگا اور آپ کو نماز فجر کے بعد جب آرام باغ کے مطب میں مریضوں کو چیک کرنے کے لیے آرہے تھے، شہید کر دیا۔ شہادت کے وقت آپ روزے سے تھے۔ آپ کی نماز جنازہ مزار قائد کے قریب واقع مسجد طیبہ میں ادا کی گئی اور مدینتہ الحکمت میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمدرد ملت حکیم محمد سعید کے درجات کو بلند فرمائے اور ہمیں ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق دے (آمین)

ڈاکٹر رضوان ثاقب

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
NO. CPL. 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

ILLUSTRATED
FS
CLASSICS

ILLUSTRATED CLASSICS

السٹریٹڈ کلاسکس

فیروز سنز نے پہلی بار ایسے تصویری کلاسکس کا دلچسپ سلسلہ شروع کیا ہے جس میں رنگا رنگ تصویروں کے ذریعے نامور ہیروز HEROES کے کارنامے پیش کیے جاتے ہیں۔ بچے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے کوئی مزیدار فلم دیکھ رہے ہوں۔ بچوں کے علاوہ بڑے بھی ان تصویری کلاسیکوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

محمد بن قاسم ★ ٹیپو سلطان ★ شیر شاہ سوری

یہ تینوں کلاسکس چھپ چکے ہیں

اس کے علاوہ دوسرے ہیروز HEROES پر کام ہو رہا ہے۔

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور راولپنڈی کراچی

خود پڑھیے تحفہ میں دیجیے

قیمت فی کلاسک : ۴۰/- روپے